مسلمان کا ناحق قتل؛ اقسام اور احکام

[بالخصوص مجاہدینِ اسلام کی رہنمائی کے لیے]

[غاية المنتهى]

في معرفة أنواع قتل المسلم بغير حق وأحكامها

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین ومن تبعھم بإحسان إلی یوم الدین، أما بعد

شعبان ۱۴۳۸ھ میں ہماری طرف ایک سوال موصول ہوا جس میں مجاہدین کی ایک کارروائی میں غلطی سے ایک عام مسلمان کے قتل کی بابت استفسار تھا۔ اس سوال کے جواب کے لیے جس وقت بندے نے کتبِ فقہ کی طرف رجوع کیا تو مسئلے کے کئی جوانب پر بحث کی ضرورت پیش آئی اور تطبیقِ مسئلہ کے لیے کئی مختلف فروع کو مدِ نظر رکھنا پڑا۔ اسی وقت ذہن میں آیا کہ چونکہ کفر واسلام کی جنگ پیہم جاری ہے اور اس میں قتل کے ایسے کئی واقعات پیش آجاتے ہیں، ان واقعات میں مجاہدین کے سامنے شریعت کی رہنمائی پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے احکامات الگ کتابچے کی شکل میں مرتب کر دیے جائیں۔ یہی ارادہ اس تحریر کا محرک بنا۔

یہاں یہ واضح رہے کہ اس تحریر میں بنیادی طور پر مذہبِ حنفی کے مطابق فقہی احکام بیان کیے گئے ہیں، ذیل میں دوسرے مذاہب کا بھی ذکر آگیا ہے۔ مذہبِ حنفی کے مطابق بیان کرنے کا سبب یہ ہے کہ ہمارے خطۂ برصغیر میں غالب اکثریتِ علماء وعامۃ المسلمین مذہبِ حنفی سے وابستہ ہیں۔ اور یہی حال برصغیر میں برسرِ پیکار مجاہدین اور جہادی جماعتوں کا ہے۔ نیز یہ بات اھل السنۃ والجماعۃ کے علماء کے یہاں مسلّم ہے کہ جس علاقے میں جس مذہبِ فقہی کے پیروکار موجود ہوں، وہاں اسی کی اتباع میں دین کی حفاظت ہے اور وہاں اسی کے علماء کی طرف رجوع کرنا لازم ہوتا ہے، الا یہ کہ دوسرے مذہب کے علماء بھی موجود ہوں۔ یہ مسئلہ معاصر علمائے سلفیہ کے فتاویٰ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

دوسرا سبب یہ بھی ہے جنگ سے متعلق جس قدر احکامات ہیں، ان کا مجموعی نتیجہ اجتماعیت پر مرتب ہوتا ہے۔ وہ محض شخصی نجی زندگی کے احکام نہیں ہیں۔ اس لیے کسی ایک جہادی تحریک کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ

اجتماعیت کے احکام میں تنوع پیدا کرے۔ یہی وجہ تھی کہ جب تک مسلمانوں کو دنیا میں عروج حاصل تھا اور وہ اپنے اجتماعی وسلطانی امور شریعت کے موافق چلا رہے تھے، تو سلطانی امور کا بیشتر حصہ ایک ہی مذہب کے مطابق نافذ رہا ہے۔ اسی مناسبت سے ہمارے خطے میں تحریکِ جہاد کی ناگزیر ضرورت ہے کہ وہ مذہبِ حنفی کے مطابق جنگ وامن اور قتل وقتال کے احکامات پر عمل کریں۔ البتہ اس کا یہ ہر گز مطلب نہیں ہے کہ اس میں بھی کسی بھی مسئلے میں مذہبِ غیر پر عمل کی گنجائش نہ ہو۔ نہیں، بلکہ جہاں کہیں اجتماعی ضرورت کسی مسئلے میں مذہبِ غیر کی طرف رجوع کا مطالبہ کرے تو ضرور علمائے کرام کی مشاورت سے ضرورت کے مطابق مخارج نکالنے چاہییں۔ اللہ تعالیٰ بے جا اور اندھے تعصب سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھیں اور دین کا صحیح فہم اور اس کے مطابق درست عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

اس تحریر میں درج ذیل فصول شامل ہیں:

فصل اول: مسلمان کی جان ومال وآبرو کی حرمت کا بیان

فصل دوم: قتل اور اس کے احکام

فصل سوم: دار الاسلام میں قصاص ودیت کی سزاؤں کی تنفیذ سے متعلق احکام

فصل چہارم: دار الحرب میں مقیم مسلمان کی جان ومال کی عصمت کا بیان اور قتل کے احکام

فصل پنجم: تترس کے احکام

فصل ششم: مجاہدین کے ہاتھوں سرزد ہونے والے قتل کی صورتیں اور ان کے احکام

احکام کے بیان میں کوشش یہی رہی ہے کہ طوالت سے بچتے ہوئے اختصار سے کام لیا جائے۔ دلائل کا بیان جہاں ناگزیر ہوا، وہاں کیا گیا ہے۔ کتابچے کا نام 'غاية المنتهى في معرفة أنواع قتل المسلم بغير حق وأحكامها' رکھا گیا ہے۔

اپنی کم علمی کے اعتراف کے ساتھ یہ کوشش علمائے کرام کی خدمت میں حاضر ہے۔ یقیناً مسائلِ شریعت کا بیان اور ان کی تطبیق بہت بھاری بوجھ اور بڑی مسؤولیت ہے، دورانِ تحریر کئی مرتبہ خیال دل میں گزرا کہ اپنی حیثیت سے یہ کام بہت بڑا ہے۔ لیکن ہر اگلے لمحے یہ احساس دامن گیر ہوا کہ اتنے مسائل مجاہدینِ امت اور

ہماری امت کو پیش آرہے ہیں جن کا حل دستیاب نہیں ہے۔ جو میدانِ جہاد سے باہر کے حضرات ہیں، وہ عالمی کفری طاقتوں کی سازشوں، عالمی وعلاقائی سیاست اور میدانی حالات سے کماحقہ واقف نہیں ہیں اور جو میدان میں موجود ہیں، انھیں مشاغلِ جہاد سے فرصت نہیں ہے۔ بالآخر خلا کو پُر بھی کیا جانا چاہیے۔ اسی داعیے کے تحت یہ تحریر مکمل کی ہے۔

اس سب کے ساتھ میدانِ جہاد میں موجود اور میدان سے باہر موجود علمائے کرام کی خدمت میں گزارش ہے کہ جہاں کہیں کسی مسئلے میں بندے سے خطا ہوئی ہے، اس کی اصلاح کر دی جائے اور بندے کو بھی مطلع کر دیا جائے، تاکہ وہ اپنی اصلاح کر لے۔ بلاشبہ یہ کسی انسان کے لیے بڑی ناکامی کی بات ہے کہ وہ اپنی غلطی پر اصرار کرے اور حق کو قبول کرنے کی بجائے تکبر کی راہ اپنائے۔ اللہ تعالیٰ بندے کو اس سے محفوظ فرمائیں، آمین۔

ساتھ ہی یہ گزارش بھی ہے کہ جو بھی اس تحریر پر نظر دوڑائے، وہ بندے کو اپنی نیک دعاؤں میں ضرور یاد رکھے جس کا فائدہ اسے روزِ قیامت ہو جائے۔

اس مقدمے میں، میں اپنے عزیز دوست اور بھائی مولانا عمار خان ترنگزئی صاحب کا شکریہ ضرور ادا کروں گا جن کے ساتھ ابتدائی طور پر مسئلہ قتل پر گفتگو ہوئی اور انھوں نے چند مسائل کی تخریج بھی کی۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں برکت عطا فرمائیں اور ان کی کاوشوں کو امتِ مسلمہ کے لیے نافع بنائیں، آمین۔

اللہ تعالیٰ بندہ سے یہ تحریر خالص اپنی رضا میں قبول فرمائیں اور اسے بندہ سمیت تمام مجاہدین کے لیے نافع بنائیں، آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین!

محرم الحرام ۱۴۳۹ھ

فصل اول: مسلمان کی جان ومال وآبرو کی حرمت کا بیان

مبحث اول: ایک مسلمان کی جان ومال وآبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے

جو شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد ﷺ کی رسالت اور ختمِ نبوت پر ایمان لائے، اور آپ ﷺ کے لائے ہوئے تمام احکامات کو قبول کرلے، تو وہ مسلمان ہے۔ دوسرے تمام مسلمانوں کے لیے اس مسلمان کی جان، مال، عزت محترم ومعصوم ہے اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کی جان لے، مال لوٹے یا عزت دری کرے۔ اس کی ممانعت قرآن وحدیث میں بے شمار مقامات پر وارد ہوئی ہے۔ اور اس پر تمام علمائے امت کا اتفاق ہے کہ ایسا کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا﴾ [النساء:۹۳]

اور فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ كَذَلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا﴾ [النساء:۹۴]

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسو اللہ ﷺ نے فرمایا:

أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ۔[1]

اسی طرح سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] متفق علیہ [صحیح البخاري؛ ص۱۶ (کتاب الإیمان؛ باب فإن تابوا وأقاموا الصلوۃ)، صحیح مسلم؛ ص۳۲ (کتاب الإیمان؛ باب الأمر بقتال الناس)]

اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا هُنَّ قَالَ الشِّرْكُ بِاللَّهِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَكْلُ الرِّبَا وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ وَالتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ۔[2]

اس حدیث میں سات وہ گناہ بیان ہوئے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے قبیح ہیں، ان میں سے چار کا تعلق دوسرے مسلمان کی جان، مال اور آبرو سے ہے:

1. معصوم جان کو قتل کرنا
2. سود کھانا
3. یتیم کا مال کھانا
4. پاک باز بیبیوں پر تہمت لگانا

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کا اس قدر عزت و شرف واحترام سکھایا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر... بروایتِ سیدنا ابو بکرہ رضی اللہ عنہ... یہ الفاظ ادا فرمائے:

أَيُّ شَهْرٍ هَذَا قُلْنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ فَسَكَتَ حَتَّى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ قَالَ أَلَيْسَ ذُو الْحِجَّةِ قُلْنَا بَلَى قَالَ فَأَيُّ بَلَدٍ هَذَا قُلْنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ فَسَكَتَ حَتَّى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ قَالَ أَلَيْسَ الْبَلْدَةَ قُلْنَا بَلَى قَالَ فَأَيُّ يَوْمٍ هَذَا قُلْنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ فَسَكَتَ حَتَّى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ قَالَ أَلَيْسَ يَوْمَ النَّحْرِ قُلْنَا بَلَى قَالَ فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ قَالَ مُحَمَّدٌ وَأَحْسِبُهُ قَالَ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِي بَلَدِكُمْ هَذَا فِي شَهْرِكُمْ هَذَا وَسَتَلْقَوْنَ رَبَّكُمْ فَسَيَسْأَلُكُمْ عَنْ

---

[2] متفق علیہ [صحیح البخاري؛ ص ٦٨٤ (کتاب الوصایا؛ باب قول اللہ تعالیٰ: إن الذین یأکلون أموال الیتامی)، صحیح مسلم؛ ص ٥٣ (کتاب الإیمان؛ باب بیان الکبائر وأکبرها)]

[3] صحیح مسلم؛ ص ١١٩٣ [کتاب البر والصلۃ والآداب؛ باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ]

أَعْمَالِكُمْ أَلَا فَلَا تَرْجِعُوا بَعْدِي ضُلَّالًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ أَلَا لِيُبَلِّغْ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَلَعَلَّ بَعْضَ مَنْ يُبَلَّغُهُ أَنْ يَكُونَ أَوْعَى لَهُ مِنْ بَعْضِ مَنْ سَمِعَهُ ... ثُمَّ قَالَ أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ مَرَّتَيْنِ۔[4]

ایک مسلمان کی عزت واحترام کا اسلام نے اس قدر خیال کیا کہ کسی مسلمان کو پریشان کرنا بھی شریعت میں حرام ٹھہرا۔ حدیث میں یہاں تک وارد ہوا:

وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي لَيْلَى قَالَ : حَدَّثَنَا أَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُمْ كَانُوا يَسِيرُونَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَامَ رَجُلٌ مِنْهُمْ ، فَانْطَلَقَ بَعْضُهُمْ إِلَى حَبْلٍ مَعَهُ ، فَأَخَذَهُ فَفَزِعَ ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يُرَوِّعَ مُسْلِمًا۔[5]

علامہ عبد الرؤف مناوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب فیض القدیر میں کسی مسلمان کو پریشان کرنے اور گھبراہٹ کا شکار کرنے کو بھی گناہِ کبیرہ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

فإن ترويع المسلم حرام شديد التحريم ومنه يؤخذ أنه كبيرة۔[6]

مبحث دوم: کسی مسلمان کو قتل کرنا، اس کا مال لوٹنا اور اس کی ہتکِ عزت کرنا شریعت کی نظر میں قابلِ سزا جرائم ہیں

مسلمان کی جان ومال وآبرو کی اس حرمت کے دفاع کے لیے شریعت میں ہر اس شخص کے لیے سزائیں مقرر ہوئیں جو دوسرے مسلمان کی جان ومال وآبرو سے تعرض کرے۔

جو کوئی دوسرے مسلمان کی جان سے تعرض کرے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے قصاص، دیت اور کفارے کی سزائیں مقرر فرمائیں۔

---

[4] رواہ البخاري؛ ص۱۰۷۸[کتاب المغازي؛ باب حجۃ الوداع]

[5] رواہ أبو داود؛ ص۱۵۴۱[کتاب الأدب؛ باب من یأخذ الشيء علی المزاح]

[6] فیض القدیر؛ ج۶، ص۲۱۱[رقم الحدیث:۸۹۸۱]

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ (178) وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ(179)﴾ [البقرة]

﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ [المائدة:45]

جو کوئی دوسرے مسلمان کا مال چوری کرے، تو اس کے ہاتھ کاٹنے کی حد مقرر ہوئی۔

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ [المائدة:38]

جو کوئی دوسرے مسلمان پر زنا کی تہمت لگائے اور اس کی ہتکِ عزت کرے تو اس کے لیے اسّی [۸۰] کوڑوں کی حد مقرر ہوئی۔

﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ [النور:4]

اس آیت میں پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت کا ذکر ہوا ہے۔ یہی حکم مسلمان مرد پر زنا کی تہمت کا بھی ہے، اور اس پر مسلمانوں میں اجماع ہے۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

هذه الآية الكريمة فيها بيان حكم جلد القاذف للمحصنة، وهي الحرة البالغة العفيفة، فإذا كان المقذوف رجلا فكذلك يجلد قاذفه أيضًا، ليس في هذا نزاع بين العلماء.[7]

زنا سے کم کوئی تہمت لگائے یا ہتکِ عزت کرے تو اس کے لیے شریعت میں تعزیری سزا مقرر ہوئی جو قاضی کے فیصلے پر انتالیس کوڑے یا اس سے کم کی شکل میں دی جائے گی۔

رب کائنات نے اپنی کتاب میں یہ سزائیں اتار کر رہتی دنیا تک کے لیے ان سزاؤں کو متعین کر دیا ہے اور

---

[7] تفسیر ابن کثیر؛ ج٦، ص١٣

مسلمانوں کی جان ومال وعزت کی حفاظت کا انتظام فرمایا ہے۔ کسی مسلمان کے لیے بھی جائز نہیں کہ ان سزاؤں کو بدلے۔ بلکہ جو کوئی ان سزاؤں پر اعتراض کرے، نہ مانے یا بدلنے کی دعوت دے تو وہ خود دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

البتہ ان تمام سزاؤں کی تنفیذ میں مزید تفصیلی احکامات ملحوظ رکھے جاتے ہیں، جن کا بیان ہمارے موضوع سے باہر ہے۔

مبحثِ سوم: قتلِ مسلم کی بعض جائز صورتیں

ہر مسلمان کی جان ومال وآبرو بلاشبہ معصوم ہے، کیونکہ دینِ اسلام نے انھیں محفوظ کیا ہے۔ تاہم بعض صورتوں میں دینِ اسلام کے بعض احکام کی خلاف ورزی کی وجہ سے مسلمان کی جان غیر معصوم بھی ہو جاتی ہے اور اس کا قتل واجب یا مباح ہو جاتا ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان روایت کیا ہے:

لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَّا بِإِحْدَى ثَلَاثٍ الثَّيِّبُ الزَّانِي وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ وَالتَّارِكُ لِدِينِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ۔[8]

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں تین صورتوں میں مسلمان کے قتل کو جائز قرار دیا:

1. شادی شدہ زانی مسلمان کو رجم کے ذریعے قتل کیا جائے گا۔
2. جو کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کرے، تو شروط پوری ہونے پر اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔
3. وہ مسلمان جو دینِ اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو جائے، تو اسے قتل کیا جائے گا۔

ان تین صورتوں کے علاوہ درج ذیل صورتوں میں بھی مسلمان کا قتل جائز ہو جاتا ہے، کیونکہ ان کی بابت بھی احادیث وارد ہوئی ہیں:

---

[8] متفق علیہ [صحیح البخاري؛ ص ۱۰۷۱ (کتاب الدیات، باب قول اللہ تعالی: أن النفس بالنفس...)، صحیح مسلم؛ (کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات؛ باب ما یباح بہ دم المسلم)]

4. جب مسلمان کسی خطے میں ایک مسلمان عادل حاکم کے ہاتھ پر جمع ہوں، اس وقت کوئی مسلمان ان کے خلاف بغاوت کرے اور قتال کرے تو اس کے خلاف قتال جائز ہے[9]۔

5. جو مسلمان قومِ لوط علیہ السلام کا فعل کرے، تو اسے قتل کیا جائے گا۔

6. جو مسلمان قتل اور لوٹ مار کے ذریعے زمین میں فساد مچائے اور دوسرے مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے [یعنی عدوِ صائل بنے] تو اسے قتل کرنا جائز ہے۔

7. مسلمانوں میں سے کوئی جماعت جمع ہو کر اسلام کے احکام میں سے کسی حکم کو معطل کر دیں تو ان کے خلاف قتال جائز ہو گا۔ جیسا کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے انکاری ہو جائیں۔

8. جادو گر کو قتل کیا جائے گا۔

9. جو مسلمان کافروں کا جاسوس ہو، تو اسے قتل کرنا جائز ہے۔

یہاں علمائے کرام نے اس پر بحث فرمائی ہے کہ حدیثِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں تو صرف تین حالتوں میں قتل کو حصر کیا گیا ہے، باقی صورتوں میں قتل کیسے جائز ہے؟ جواب میں بعض علماء نے حدیث میں بیان کردہ حصر کو علی الاطلاق نہیں لیا ہے، بلکہ تاکید پر محمول کیا ہے، جبکہ بعض دوسروں نے دیگر بیان کردہ صورتوں کو حدیث میں بیان کردہ تین صورتوں کی ہی مختلف شکلیں قرار دیا ہے۔ الغرض، یہاں اس کلام کی طرف صرف اشارہ مقصود ہے، تفصیل کے لیے امام ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ کی جامع العلوم والحکم اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی فتح الباری کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے۔[10]

پس اس سے معلوم ہوا کہ عام مسلمان کی حرمت اسی وقت تک قائم ہے، جب تک کہ وہ ان امور سے خود کو

---

[9] البتہ جب بغاوت تھم جائے یا باغیوں کا زور ٹوٹ جائے تو اس کے بعد کسی بھی باغی کو... چاہے پہلے سے پکڑا ہو یا ابھی پکڑا گیا ہو... قتل کرنا جائز نہیں رہتا۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان اپنی ذات کی حد تک ایسے حاکمِ مسلم کا مخالف ہے تو اس کا قتل بھی جائز نہیں، بلکہ اس کے شر سے بچنے کے لیے اسے قید میں ڈالا جاسکتا ہے۔

[10] دیکھیے: جامع العلوم والحکم؛ ص ۳۰۱ تا ۳۱۳ [الحدیث الرابع عشر]، فتح الباري؛ ج ۱۲، ص ۲۱۲ [کتاب الدیات؛ باب قول اللہ تعالی إن النفس بالنفس]

بچائے رکھے جو اس کی جان کی عصمت کو زائل کرنے والے ہیں، اور جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ ان امور کے علاوہ کوئی مسلمان چاہے کتنے ہی گناہ کرے، اس کی جان معصوم ہوتی ہے۔

فصل دوم: قتل اور اس کے احکام

پچھلی فصل میں ہم نے مسلمان کی قتل کی حرمت بیان کی، اور آخر میں بعض صورتوں کا ذکر کیا جن میں کسی مسلمان کا قتل جائز ہوتا ہے۔ اس فصل میں ہم کسی مسلمان کے ناجائز قتل کی صورتیں اور ان کے احکام پڑھیں گے۔

مبحثِ اول: قتل کی اقسام

کتبِ احناف میں قتل کی درج ذیل پانچ قسمیں بیان کی گئی ہیں:

1. قتلِ عمد
2. قتل شبہ عمد
3. قتل خطا
4. قتل مثلِ خطا
5. قتل بسبب

اکثر علمائے متقدمین بشمول ائمہ مجتہدین رحمۃ اللہ علیہم نے قتل کی تین ہی قسمیں بیان کی ہیں؛ عمد، شبہ عمد اور خطا[11]۔ البتہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں قتل کی بس دو ہی قسمیں ہیں؛ عمد اور خطا۔ یہی وجہ ہے کہ مالکیہ دو ہی قسمیں بیان کرتے ہیں۔[12] امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین رحمۃ اللہ علیہما سے بھی تین قسمیں ہی منقول ہیں۔ بعد کے ائمہ احناف نے قتل کی صورتوں کے تعین کے لیے دو مزید قسموں کا اضافہ کیا۔

---

[11] دیکھیے: کتاب الأصل للإمام محمد بن حسن؛ ج۶، ص۷ ۵۴، مغني المحتاج للشربيني؛ ج۴، ص۶، المغني لابن قدامة؛ ج۷، ص۴۲۸، مجموع الفتاویٰ لابن تیمیۃ؛ ج ، ص۲۰۶۔

[12] دیکھیے: شرح الخرشي علی مختصر الخليل؛ ج۸، ص۷ وما بعدها۔

قتلِ عمد

یہ وہ قتل ہے جس میں قاتل جانتے بوجھتے ایسے آلہ سے مقتول پر وار کرے جس میں جسم کاٹنے چیرنے کی صلاحیت ہو یا جسمانی اعضا کو جدا کر کے رکھ دے۔ ایسے آلات میں درج ذیل شامل ہیں:

- دھاری دار ہتھیار... چاہے لوہے سے بنا ہو یا کسی دوسری دھات سے
  [جس میں تلوار، تیر، نیزہ، چاقو اور موجودہ دور کی پستول، بندوق کی چلتی گولی وغیرہ شامل ہے]
- دھاری دار لکڑی، پتھر، شیشہ
- جسم کی نازک جگہ پر سوا گھونپنا
- آگ میں ڈالنا یا بھڑکتے ہوئے تنور میں ڈالنا

مذکورہ بالا آلات کا استعمال قاتل کے ارادۂ قتل پر دلالت کرتا ہے۔ پس جہاں یہ پایا جائے، وہاں قاتل کا انکار معتبر نہ ہو گا۔

در مختار میں لکھا ہے:

والأول (عمد وهو أن يتعمد ضربه) أي ضرب الآدمي في أي موضع من جسده (ب) آلة تفرق الأجزاء مثل (سلاح) ومثقل لو من حديد جوهرة (ومحدد من خشب) وزجاج (وحجر) وإبرة في مقتل برهان (وليطة) وقوله (ونار) عطف على محدد لأنها تشق الجلد وتعمل عمل الذكاة حتى لو وضعت في المذبح فأحرقت العروق، يعني إن سال بها الدم وإلا لا، كما في الكفاية۔ قلت: في شرح الوهبانية: كل ما به الذكاة به القود وإلا فلا اهـ[13]

قتل شبہ عمد

اس سے وہ قتل مراد ہے کہ قاتل نے جانتے بوجھتے ہوئے مقتول کو ایسے آلہ سے ضرب لگائی جو بالعموم جسم کو چیرنے سے قاصر ہو، اور نہ ہی قاتل کا ارادہ قتل کرنے کا ہو، لیکن اس ضرب سے قتل واقع ہو جائے۔ ایسے

---

[13] ردالمحتار؛ ج۱۰، ص۱۵۵

آلے میں وہ لکڑی یا پتھر شامل ہے جو دھاری دار [نوکیلا] نہ ہو۔

در مختار میں لکھا ہے:

(و) الثاني (شبهه وهو أن يقصد بغير ما ذكر) أي بما لا يفرّق الأجزاء ولو بحجر وخشب كبيرين عنده خلافا لغيره۔[14]

ایسے قتل کو شبہ عمد کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں قاتل نے اقدام جانتے بوجھتے کیا، گو قتل کا اقدام نہ تھا۔ لیکن جب قاتل کے اسی اقدام سے قتل واقع ہو گیا تو شبہِ عمد قرار دیا گیا۔

شبہِ عمد کی بابت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی توضیح

قتلِ عمد اور شبہ عمد کی بابت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کی تعریفات میں کچھ اختلاف ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ قتلِ عمد وشبہ عمد میں آلہ کی تخصیص کرتے ہیں جبکہ صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کہتے ہیں کہ عمداً ایسا طریقہ اختیار کرنا جس میں قتل کا غالب امکان ہو تو قتلِ عمد ہے اور اگر قتل کا غالب امکان نہ ہو تو شبہِ عمد ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے بعض واقعات میں قتل کی نوعیت کے تعین میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص دوسرے کو کنویں میں گرا دے یا پہاڑ سے لڑھکا دے تو امام صاحب کے نزدیک یہ شبہ عمد ہے، جبکہ صاحبین کے نزدیک یہ عمد شمار ہوتا ہے۔ یہی معاملہ قتل بالمثقل [غیر دھاری دار] کا ہے۔

اس حوالے سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک سمجھنا ضروری ہے کہ امام صاحب نے ہر اس آلے کے استعمال کو شبہِ عمد میں شمار کیا ہے جس کا استعمال بالعموم قتل پر منتج نہیں ہوتا۔ سو یہ آلے کا استعمال قاتل کے ارادۂ قتل کی نفی کرتا ہے۔ رد المحتار میں معراج الدرایۃ کے حوالے سے لکھا ہے:

وفي المعراج عن المجتبى: يشترط عند أبي حنيفة أي في شبه العمد أن يقصد التأديب دون الإتلاف۔[15]

لیکن اگر اسی آلے سے قاتل کا ارادہ قتل کرنے کا ہو، تو ایسے میں یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی قتلِ عمد

---

[14] رد المحتار؛ ج ۱۰، ص ۱۵۸

[15] رد المحتار؛ ج ۱۰، ص ۱۵۹

ہے۔ علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اعلاء السنن میں لکھتے ہیں:

بل مذهبه إن القتل بالمثقل غير موجب للقود إذا لم يكن القتل مقصودًا للقاتل كما نص عليه في المجتبى ونقل عنه العيني في البناية۔[16]

پس اس سے ثابت ہوا کہ جہاں معلوم ہو جائے کہ قاتل کا ارادہ قتل ہی کا تھا تو چاہے اس قسم کا آلہ اختیار کیا گیا ہو جو جسم کو نہیں چیرتا، تب بھی اسے عمد ہی تصور کیا جائے گا۔ اور قاتل کے ارادے کا تعین خود قاتل کے اقرار یا قرائن سے ہو گا۔ مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ نے احسن الفتاویٰ میں اسی تحقیق کو قبول کیا ہے[17]۔

اسی بنیاد پر آج اگر پہاڑ سے گرانے، دریا میں ڈبونے اور گلہ گھونٹ کر قتل کرنے میں قاتل کا ارادۂ قتل متحقق ہو جائے تو یہ عمد ہے، وگرنہ شبہِ عمد۔ البتہ صاحبین رحمہما اللہ کے مسلک پر ان صورتوں کو عمد میں داخل کیا جا سکتا ہے۔

قتلِ خطا

اگر فاعل کے ارادے کے برخلاف قتل واقع ہو جائے تو اسے قتلِ خطا کہتے ہیں۔ یہ غلطی دو نوعیت کی ہوتی ہے:

- اول: فاعل کے گمان کی غلطی۔ یعنی ایک شخص نے جانور سمجھ کر تیر چلایا، لیکن وہ جانور کی جگہ انسان تھا۔ اسی طرح کافر سمجھ کر قتل کیا، لیکن معلوم ہوا کہ وہ مسلمان تھا۔
- دوم: فعل کی غلطی۔ تیر تو اس نے جانور کا نشانہ لے کر چلایا، لیکن وہ چوک گیا اور کسی آدمی کو جا لگا۔ اسی طرح کافر کی طرف چلایا، لیکن وہ چوک کر کسی مسلمان کو جا لگا۔

یہ دونوں صورتیں قتلِ خطا کی ہیں۔

در مختار میں لکھا ہے:

(و) الثالث (خطأ وهو) نوعان لأنه إما خطأ في ظن الفاعل ك (أن يرمي شخصا ظنه صيدا أو حربيا) أو مرتدا (فإذا هو مسلم أو) خطأ في نفس الفعل كأن يرمي

---

[16] إعلاء السنن؛ ج ۱۷، ص ۸۳۷۵

[17] دیکھیے: احسن الفتاوی؛ ج ۸، ص ۵۳۱

(غرضا) أو صيدا (فأصاب آدميا) أو رمى غرضا فأصابه ثم رجع عنه أو تجاوز عنه إلى ما وراءه فأصاب رجل۔[18]

قتل مثلِ خطا

یہ وہ قتل ہے جس میں اگر چہ فاعل کا فعل براہِ راست قتل کا باعث بنے، لیکن فاعل کی طرف سے سرے سے اقدام کی نیت ہی مفقود ہو۔ جیسا کہ

- کوئی شخص سوتے ہوئے کسی دوسرے شخص پر ایسا پلٹا کہ وہ دوسرا شخص مر گیا۔ یا
- کسی مکان کی چھت یا اونچی سطح پر کسی شخص سے اینٹ یا لکڑی کا تختہ گرا اور نیچے موجود دوسرے شخص پر جالگا جس سے وہ مر گیا۔

در مختار میں لکھا ہے:

(و) الرابع (ما جرى مجراه) مجرى الخطأ (كنائم انقلب على رجل فقتله) لأنه معذور كالمخطیء۔[19]

قتل بسبب

اس سے وہ قتل مراد ہے کہ جس میں قتل براہِ راست فاعل سے سرزد نہیں ہوا، بلکہ فاعل کے کسی دوسرے فعل کے نتیجے میں قتل سرزد ہو گیا۔ مثلاً

- کسی شخص نے دوسرے کی زمین میں کنواں کھودا اور کوئی شخص لاعلمی میں اس میں گر کر مر گیا۔ یا
- راستے میں کوئی بڑا پتھر رکھ دیا، کوئی مسافر رات میں لاعلمی کی وجہ سے اس سے ٹکرا کر مر گیا۔

مذکورہ بالا صورتوں میں اگر مرنے والے شخص کو کنویں یا پتھر کے موجود ہونا کا علم ہو گیا ہو تو پھر یہ 'قتل بسبب' سے خارج ہے، کیونکہ اب مرنے والا خود اپنی موت کا ذمہ دار ہے۔

در مختار میں لکھا ہے:

---

[18] ردالمحتار؛ج ۱۰، ص ۱۶۰

[19] ردالمحتار؛ج ۱۰، ص ۱۶۱

(و) الخامس (قتل بسبب كحافر البئر وواضع حجر في غير ملكه) بغير إذن من السلطان۔ ابن كمال۔ وكذا وضع خشبة على قارعة الطريق ونحو ذلك إلا إذا مشى على البئر ونحوه بعد علمه بالحفر ونحوه۔[20]

مبحثِ دوم: مذکورہ بالا اقسام کی سزاؤں کا بیان

قتلِ عمد کی سزا

شریعت میں قتلِ عمد کی سزا یہ ہے کہ

- قاتل کو مقتول کے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔
- البتہ اگر مقتول کے اولیاء[ورثاء] چاہیں تو قاتل کو معاف کرسکتے ہیں۔
- اور اگر چاہیں تو قاتل کی رضامندی سے دیت پر یا اس سے زائد مال پر صلح کرسکتے ہیں۔
- ایسے میں یہ دیت قاتل کے اپنے مال میں سے واجب الادا ہوگی۔ اور جس قدر وقت مقرر کیا جائے گا، اس میں واجب الادا ہوگی۔ اگر وقت مقرر نہ کیا جائے تو فوری واجب الادا ہوگی۔

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَمن قتل عمدا فَهُوَ قَود۔[21]

دوسری روایت میں سیدنا ابو شریح خزاعی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ أُصِيبَ بِقَتْلٍ أَوْ خَبْلٍ فَإِنَّهُ يَخْتَارُ إِحْدَى ثَلَاثٍ إِمَّا أَنْ يَقْتَصَّ وَإِمَّا أَنْ يَعْفُوَ وَإِمَّا أَنْ يَأْخُذَ الدِّيَةَ فَإِنْ أَرَادَ الرَّابِعَةَ فَخُذُوا عَلَى يَدَيْهِ وَمَنْ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔[22]

---

[20] رد المحتار؛ ج ۱۰، ص ۱۶۱

[21] سنن أبي داود؛ ص ۴۹۷ [كتاب الديات؛ باب من قتل عميا بين قوم]، سنن النسائي؛ ص ۷۳۱ [كتاب القسامة؛ باب من قتل بحجر أو سوط]، سنن ابن ماجہ؛ ج ۳، ص ۶۵۳ [أبواب الديات؛ باب من حال بين ولي المقتول وبين القود أو الدية]

[22] سنن أبي داود؛ ص ۴۹۲ [كتاب الديات؛ باب الإمام يأمر بالعفو في الدم]

امام محمد بن حسن رحمہ اللہ کی کتاب الأصل میں لکھا ہے:

وكل رجل قتل قتيلا بسيف أورمح أورماه بسهم أونشّابة أوعمود حديد أوما أشبه ذلك من السلاح فإن عليه فيه القصاص، إلا أن يعفو أولياء القتيل أويصالحوا على ما شاؤوا وتراضوا عليه۔ وكل ما اصطلحوا عليه من شيء فهو جائز وإن جاوزوا بذلك الدية۔[23]

قتلِ عمد میں قاتل پر کفارہ نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں قتلِ عمد میں کفارے کا ذکر نہیں فرمایا، وجہ اس کی یہ ہے کہ کفارہ کسی خطا کے ازالے کے لیے ہوتا ہے جبکہ قتلِ عمد گناہِ کبیرہ اور اس قدر شنیع فعل ہے جس کا ازالہ کفارہ سے نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ بالا حکم میں سے درج ذیل صورتیں مستثنیٰ ہیں:

- اگر والد اپنے بیٹے کو قتل کر دے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، بلکہ اس کے اپنے مال میں سے دیت لی جائے گی۔ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مروی ہے:

لا يقاد الوالد بالولد۔[24]

- قاتل اگر عاقل و بالغ نہ ہو تو اس پر قصاص نہیں، جیسا کہ بچہ اور پاگل اگر کسی کو قتل کر دیں تو ان پر قصاص نہیں۔
- اگر قاتل پر قصاص کا حکم عائد ہو گیا لیکن ابھی وہ اولیائے مقتول کے حوالے نہیں ہوا تھا کہ پاگل ہو گیا تو اس پر سے بھی قصاص ساقط ہو جائے گا۔
- اگر مقتول کے اولیاء میں سے کوئی ایک بھی قاتل کو معاف کر دے تو قصاص کا حکم ساقط ہو جاتا ہے، باقی اولیاء دیت میں سے اپنا حصہ لے سکتے ہیں۔

---

[23] کتاب الأصل؛ ج٦، ص ٥٧٣

[24] جامع الترمذي؛ ص ١٣٣١[کتاب الدیات؛ باب ماجاء في الرجل يقتل إبنه]، سنن ابن ماجہ؛ ج٣، ص ٦٧٤[أبواب الديات؛ باب لايقتل والد بولده]، واللفظ للترمذي۔

- اگر کسی مقتول کا کوئی ولی نہیں تو حاکمِ مسلم اس کی طرف سے سزا دلوائے گا، جس میں وہ قاتل سے یا قصاص لے، یا دیت پر صلح کر سکتا ہے۔ مطلق معاف نہیں کر سکتا۔ فتاوی تاتار خانیۃ میں لکھا ہے:

ولو أرادا الإمام أن يصالح في هذه الصورة فله ذلك، ولو أراد أن يعفو عن القصاص ليس له ذلک، لما فيه من إبطال حق جماعة المسلمين من غير عوض۔[25]

قتل شبہ عمد کی سزا

قتل شبہِ عمد کی سزا یہ ہے کہ

- قاتل پر کفارہ لازم ہے۔
- قاتل کی عاقلہ پر دیتِ مغلظہ واجب ہے۔
- اولیائے مقتول چاہیں تو معاف کر دیں یا فریقین کی رضامندی سے متعین مال پر صلح کر لیں۔

در مختار میں لکھا ہے:

(وموجبه الإثم والكفارة ودية مغلظة على العاقلة... لا القود)۔[26]

قتلِ خطا اور قتل مثلِ خطا کی سزا

قتلِ خطا اور قتل مثلِ خطا کی سزا یہ ہے کہ

- قاتل پر کفارہ لازم ہے۔
- قاتل کی عاقلہ پر دیت واجب ہے۔
- اولیائے مقتول چاہیں تو معاف کر دیں یا فریقین کی رضامندی سے متعین مال پر صلح کر لیں۔

در مختار میں لکھا ہے:

(وموجبه) أي موجب هذا لنوع من الفعل وهو الخطأ وما جرى مجراه (الكفارة

[25] الفتاوی التاتارخانیۃ؛ج۱۹، ص۱۲۳

[26] رد المحتار؛ ج۱۰، ص۱۵۹

والدية على العاقلة) والإثم دون إثم القتل۔[27]

قتل بسبب کی سزا

قتل بسبب کی سزا یہ ہے کہ

- قاتل کی عاقلہ پر دیت واجب ہے
- قاتل پر کفارہ نہیں ہے۔

در مختار میں لکھا ہے:

(وموجبه الدية على العاقلة لا الكفارة) ولا إثم القتل۔[28]

مذکورہ بالا قتل کی پہلی چار اقسام میں قاتل اگر عاقل و بالغ ہو اور رشتے کی بنا پر مقتول کا وارث بھی بنتا ہو تو قاتل میراث سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ حکم قتل بسبب کا نہیں ہے۔ در مختار میں لکھا ہے:

(وكل ذلک يوجب حرمان الإرث) لو الجاني مكلفا۔ ابن كمال (إلا هذا) أي القتل بسبب لعدم قتله۔[29]

تنبیہ: حاکمِ مسلم سے سرزد ہونے والے قتل کے احکام

مذکورہ بالا قتل کے احکام حاکمِ مسلم پر بھی منطبق ہوں گے۔ صرف ایک صورت میں اس کا معاملہ مختلف ہو گا۔ وہ یہ کہ اگر اس نے اجتہاد کر کے کسی شخص کے قتل کا حکم دیا یا خود قتل کیا اور بعد میں معلوم ہو گیا کہ اس کا اجتہاد غلط تھا تو ایسے میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق دیت بیت المال سے ادا کی جائے گی، جبکہ صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کے مطابق دیت اس کی عاقلہ پر واجب ہو گی۔ المغني میں لکھا ہے:

وأما خطأ الإمام والحاكم في غير الحكم والاجتهاد فهو على عاقلته بغير خلاف إذا كان مما تحمله العاقلة، وما حصل باجتهاده ففيه روايان: إحداهما: على

---

[27] رد المحتار؛ ج ۱۰، ص ۱۶۱

[28] رد المحتار؛ ج ۱۰، ص ۱۶۲

[29] رد المحتار؛ ج ۱۰، ص ۱۶۲

عاقلته...، والثانية: هو في بيت المال، وهو مذهب الأوزاعي والثوري وأبي حنيفة وإسحاق لأن الخطأ يكثر في أحكامه واجتهاده فايجاب عقله على عاقلته يجحف بهم ولأنه نائب عن الله تعالىٰ في أحكامه وأفعاله فكان أرش جنايته في مال الله سبحانه وتعالىٰ، وللشافعي قولان كالروايتان۔[30]

اس سے قاضی [اور وہ حاکم جو قضا کے ذریعے فیصلہ دے] مستثنیٰ ہیں کہ اگر قاضی قتل کے کسی معاملے میں قصاص کا فیصلہ دے، لیکن بعد میں معلوم ہو کہ ثبوت غلط یا گواہ جھوٹے تھے، تو اب جس کے حق میں قاضی نے فیصلہ دیا تھا، دیت اس کے ذمہ لازم ہو گی۔ رد المحتار میں لکھا ہے:

القضاء بخلاف الحق: إما عن خطأ أو عمد، وكل على وجهين: إما في حقه تعالى أو حق العبد، فالخطأ في حق العبد إما أن يمكن فيه التدارك والرد أو لا... وإن لم يمكن الرد بأن قضى بالقصاص واقتص لا يقتل المقضي له ويصير صورة القضاء شبهة مانعة بل تجب الدية في مال المقضي له وهذا كله إذا ظهر خطأ القاضي بالبينة أو بإقرار المقضي له فلو بإقرار القاضي لا يظهر في حق المقضي له حتى لا يبطل القضاء في حقه۔[31]

مبحثِ سوم: قصاص، دیت اور کفارہ کی تفصیل

قصاص

قصاص کا مطلب ہے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل کو قتل کیا جانا۔ احناف کے مطابق قاتل کو تلوار سے قتل کیا جائے۔ پھانسی دینا غیر شرعی طریقہ ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قاتل نے جس طریقے سے مقتول کو قتل کیا، اسی کے مثل مقتول کے ورثاء قاتل کو قتل کریں گے، اگر ایسا کرنا ممکن ہو۔

---

[30] المغني: ج۷، ص ۵۲۳

[31] رد المحتار: ج۸، ص ۱۱۲

قصاص لینے کا حق باتفاقِ فقہاء اولیائے مقتول کو حاصل ہے۔ اس سے میں سے درج ذیل صور تیں مستثنیٰ ہیں:

- اگر کسی مقتول کا کوئی ولی نہ ہو تو حاکمِ مسلم کو قصاص لینے کا حق حاصل ہے۔
- نابالغ بچے کی طرف سے باپ کو قصاص لینے کا حق حاصل ہے۔
- اگر غلام قتل ہو جائے تو اس کے مالک کو قصاص لینے کا حق حاصل ہے۔

دیت

قتل کے عوض مقتول کے ورثاء کو جو مالی ہرجانہ [خون بہا] ادا کیا جاتا ہے، اسے دیت کہتے ہیں۔ دیت دو طرح کی ہے۔ ایک عام اور دوسری مغلظہ۔ عام دیت کی بنیادی مقدار سو اونٹ ہے، جس میں

- بیس اونٹنیاں ایک سالہ [بنت مخاض]
- بیس اونٹ ایک سالہ [بنو مخاض]
- بیس اونٹنیاں دو سالہ [بنت لبون]
- بیس اونٹنیاں تین سالہ [الحقۃ]
- بیس اونٹنیاں چار سالہ [الجذعۃ] شامل ہونی چاہیں۔

اونٹوں کی اس خماسی تقسیم پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ البتہ شوافع اور مالکیہ کے یہاں بنو مخاض [ایک سالہ اونٹ] کی جگہ بنو لبون [دو سالہ اونٹ] شامل ہیں۔ حنابلہ کا مسلک احناف کے مثل ہے۔[32]

اس کے علاوہ عام دیت اونٹوں کی جگہ سونا چاندی سے بھی باتفاقِ علماء ادا ہو سکتی ہے۔ جس کی مقدار

- ایک ہزار دینار سونا [جس کی جدید پیمانوں میں پیمائش ۸۶،۴ کلو گرام ہے]، اور
- دس ہزار درہم چاندی [جس کی پیمائش ۰۲،۳۴ کلو گرام] ہے۔

یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور فتویٰ اسی پر ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہما کے قول میں ان تینوں کے علاوہ درج ذیل صورتوں میں بھی دیت ادا کی جا سکتی ہے:

---

32 دیکھیے: المغنی؛ ج ۷، ص ۵۱۶

- گائے: دو سو
- بھیڑ بکریاں: دو ہزار
- کپڑے: دو دو کپڑوں پر مشتمل دو سو جوڑے

دیت مغلظہ سو اونٹوں کی صورت میں ہی دی جائے گی، جس کی تقسیم رباعی ہے، یعنی پچیس ایک سالہ، پچیس دو سالہ، پچیس تین سالہ اور پچیس چار سالہ اونٹنیاں دی جائیں گی۔

دیت کس شکل میں ادا کی جائے گی، اس کا فیصلہ قاتل کرے گا۔ اگر قاضی فیصلہ کر دے، تب بھی مانا جائے گا۔

عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہے۔

یہ دیت تین سال میں ادا کی جائے گی۔ میعاد کا آغاز اس دن سے ہو گا جس دن قاضی نے فیصلہ دیا ہو گا، نہ کہ موت کے وقت سے۔

قتلِ عمد کے علاوہ باقی صورتوں میں دیت کی ادائیگی عاقلہ پر لازم ہو گی۔ البتہ اگر ان صورتوں میں قاتل خود قتل کا اقرار کر لے تو قاتل کے مال میں دیت واجب ہو گی، عاقلہ پر نہ ہو گی۔ سوائے درج ذیل دو صورتوں کے:

1. عاقلہ خود قاتل کی تصدیق کرے۔ اگر عاقلہ قاتل کی تصدیق کر لے تو اب دیت عاقلہ پر عائد ہو گی۔
2. قاتل کے اقرار کے ساتھ قاضی کے سامنے ثبوت سے بھی ثابت ہو جائے، تو ایسے میں بھی عاقلہ پر دیت واجب ہو گی۔

اسی طرح اگر قاتل اولیائے مقتول سے صلح کر لے تو اب وہ مقدار جس پر صلح ہوئی ہے، قاتل کے اپنے مال میں سے واجب الادا ہو گی۔ عاقلہ چاہے تو اس میں تعاون کر سکتی ہے۔ صلح کی صورت میں یہ مال فوراً واجب الادا ہو گا، الا یہ کہ صلح میں میعاد مقرر کر لی جائے۔

در مختار میں لکھا ہے:

(و) اعلم أنه (لا تعقل عاقلة جناية عبد ولا عمد) وإن سقط قوده بشبهة أو قتله ابنه عمدا كما مر (ولا ما لزم بصلح أو اعتراف)...(إلا أن يصدقوه في إقراره أو تقوم

حجة) وإنما قبلت بالبينة هنا مع الاقرار مع أنها لا تعتبر معه، لأنها تثبت ما ليس ثابت بإقرار المدعى عليه وهو الوجوب على العاقلة۔[33]

احناف کے راجح قول کے مطابق عاقلہ میں سے ایک فرد پر تین سال میں چار درہم سے زائد واجب الادا نہ ہوں گے، جبکہ ایک مرجوح قول میں ایک سال میں تین سے چار درہم سے زائد واجب الادا نہ ہوں گے۔

درمختار میں لکھا ہے:

(لا يؤخذ في كل سنة إلا درهم أو درهم وثلث، ولم تزد على كل واحد من كل الدية في ثلاث سنين على أربعة) على الأصح۔[34]

دیت مقتول کے ورثاء بقدرِ وراثت تقسیم ہو گی۔ اسی طرح جس مال پر صلح ہو، وہ بھی اسی تناسب سے تقسیم ہو گا۔

کفارہ

قتلِ شبہ عمد، خطا، مثلِ خطا اور قتل بسبب میں قاتل کے ذمہ کفارہ بھی لازم آتا ہے۔ کفارہ یہ ہے کہ قاتل کسی مسلمان غلام کو آزاد کرے، اگر غلام نہ ملتا ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ [النساء:92]

[33] ردالمحتار؛ ج۱۰، ص ۳۳۰

[34] ردالمحتار؛ ج۱۰، ص ۳۲۸

عاقلہ[35] کی تفصیل

عاقلہ کی بنیاد احناف اور مالکیہ نے تناصر اور باہمی امداد ونصرت کو قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ تعلق عصبات اور قبائل کے ساتھ وابستہ تھا۔ اسی لیے اس زمانے میں یہی عاقلہ کہلاتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں دواوین مرتب فرمائے، بعض قبیلوں اور بعض شہر والوں کو ایک دیوان میں مرتب کر کے ان کے مقاتلین کے لیے وظائف مقرر فرمادیے۔ اب یہی دیوان جنگوں کی اکائیوں کے طور پر بھی استعمال ہونے لگے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کسی متعین دیوان میں موجود شخص کے لیے اس کے دیوان کو ہی عاقلہ قرار دیا۔ اس کے بر خلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ہر حال میں نسب کو عاقلہ کی بنیاد قرار دے کر عصبات کو عاقلہ کا درجہ دیا ہے۔

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ 'اعلاء السنن' میں 'باب في تعيين مصداق العاقلة' میں لکھتے ہیں:

الظاهر من النصوص كون العقل على عصبة القاتل، وكان الأمر على ذلك في عهد النبي صلى الله عليه وسلم وعهد أبي بكر [رضي الله عنه]، حتى كان عمر رضي الله عنه دون الديوان وجعل الدية على أهل الديوان، وكان ذلك بمحضر من الصحابة وهم متوافرون، لم ينكره عليه أحد منهم ولم يخالف، فكان إجماعا منهم على أن مبنى العقل على التناصر دون القرابة، وبيانا منهم أن كون العقل على العصبات في عهد النبي صلى الله عليه وسلم وأبي بكر [رضي الله عنه] لم يكن لكون العقل محصورا في العصبات مختصا بهم، بل لكون التناصر مختصا بالعصبات إذ ذاك، فلما انتقل إلى أهل الديوان انتقل حكم العقل إليهم۔[36]

---

[35] لفظ عاقلہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل بھی عرب معاشرے میں جب کوئی قتل ہوتا تو خون بہا کے طور پر ولی مقتول کے باڑے میں قاتل والے اونٹ لاکر باندھ دیتے تھے، اونٹ باندھنے کے لیے عربی میں عَقَلَ الْبَعِيْرَ يَعْقِلُه کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ تسمیہ یہ ہے کہ عقل عربی میں روک رکھنے کو بھی کہتے ہیں۔ دیت کو عقل اس لیے کہا گیا کہ اس کے ذریعے آئندہ قتل کو روک دیا جاتا ہے۔

[36] إعلاء السنن؛ ج ۱۷، ص ۸۶۱۹

بعد کے ادوار میں جیسے جیسے اہلِ عجم کے علاقے فتح ہوئے اور وہ مسلمان ہوئے، تو ان میں سے بہت سے علاقوں میں اہلِ عجم کے نہ قبائل تھے اور نہ دیوان تھے، بعض جگہوں پر ایک پیشے سے منسلک لوگ باہم مددگار ہوتے تھے اور اکھٹے رہتے تھے تو متاخرین نے ایک پیشے والوں کو عاقلہ قرار دیا۔ کیونکہ اس سے قبل خلافت کے ادوار میں بعض دواوین کاموں کے لحاظ سے مرتب ہوتے تھے، جیسے سپاہیوں کا دیوان، منشیوں کا دیوان وغیرہ۔ در مختار میں لکھا ہے:

وقيل: لهم [أي لأهل العجم] عواقل، لأنهم يتناصرون كالأساكفة والصيادين والسراجين، فأهل محلة القاتل وصنعته عاقلته، وكذلك طلبة العلم۔ قلت: وبه أفتى الحلواني وغيره۔ خانية۔ زاد في المجتبى: والحاصل أن التناصر أصل في هذا الباب ومعنى التناصر أنه إذا حزبه أمر قاموا معه في كفايته۔ وتمامه فيه۔ وفي تنوير البصائر معزيا للحافظية: والحق أن التناصر فيهم بالحرف، فهم عاقلته۔[37]

ایک پیشے والے بھی اسی وقت عاقلہ قرار دیے جائیں گے جبکہ ان کے درمیان تناصر موجود ہو۔ فتاویٰ تاتارخانیہ میں لکھا ہے:

وفي الصغرى: وكذا عاقلة كل أهل صناعة أهل صناعته إن كانوا يتناصرون بها۔[38]

آج کے دور میں بیشتر معاشرتی اور عمرانی ترتیب بدل چکی ہے، بالخصوص مغربی طاقتوں کے غلبے نے مسلمانوں کے معاشرتی نظام کو تلپٹ کرکے رکھ دیا ہے۔ عرب و عجم کے قبائل بھی بہت کم اپنی ساخت محفوظ رکھ پائے ہیں۔ ایسے میں موجودہ معاشروں میں عاقلہ کا تعین نوازل میں سے ہے۔ فقہائے احناف کی مذکورہ بالا آراء کو سامنے رکھتے ہوئے آج کے دور میں عاقلہ کے تعین اس طرح ہو گا:

- جہادی جماعات... اپنی جماعت کے مجاہدین کے لیے عاقلہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔
- دینی جماعتیں... جو کسی دینی کام کی ادائیگی کے لیے باہم مربوط ہیں... وہ اپنے افراد کی عاقلہ ہیں۔

---

37 ردالمحتار؛ ج ۱۰، ص ۳۳۳

38 الفتاوی التاتارخانیۃ؛ ج ۱۹، ص ۱۰۹

- اہلِ مدارس اور ان کی تنظیمات طلبۂ مدارس کی عاقلہ ہیں۔
- پیشوں کی بنیاد پر قائم جماعتیں یا یونین وغیرہ اپنے منسلک افراد کی عاقلہ ہیں۔
- جہاں قبائل موجود ہیں، تو وہ اپنے افراد کی عاقلہ ہیں۔
- جہاں برادریوں کا اکٹھ موجود ہے، تو وہ اپنے افراد کی عاقلہ ہیں۔
- جہاں ان میں سے کچھ نہ ہو، تو ایسے فرد کی دیت مسلمانوں کے بیت المال سے ادا ہو گی۔ اگر بیت المال نہ ہو تو اس کے اپنے مال میں سے ادا ہو گی۔

مذکورہ بالا میں سے جہاں عاقلہ کی بنیاد صرف تناصر پر ہے، نسب پر نہیں ہے تو وہاں عاقلہ کے انھی لوگوں سے دیت وصول کی جائے گی جو وظیفہ لیتے ہیں اور ان کے وظیفہ سے کاٹی جائے گی۔ ردالمحتار میں لکھا ہے:

(فتؤخذ من عطاياهم أو من أرزاقهم) أي لا من أصول أموالهم۔[39]

دیت میں عاقلہ کے ساتھ قاتل بھی احناف کے نزدیک شامل ہے، وہ بھی اپنا حصہ ادا کرے گا، بشرطیکہ اسے بھی وظیفہ ملتا ہو۔ ردالمحتار میں لکھا ہے:

(والقاتل عندنا كأحدهم) يعني إذا كان من أهل العطاء، أما إذا لم يكن فلا شيء عليه من الدية عندنا أيضا۔ ذكره في المبسوط۔ وعند الشافعي: لا شيء عليه مطلقا۔ معراج۔[40]

فتاوی تاتارخانیہ میں لکھا ہے:

اعلم أن القاتل إنما يكون كأحد العواقل في أداء نصيبه من الدية إذا كان القاتل من أهل العطاء في الديوان، وأما إذا لم يكن من أهل العطاء فلا يجب عليه شيء من الدية عندنا أيضا۔[41]

اگر عاقلہ کے افراد بھی دیت کی ادائیگی کے لیے ناکافی ہوں، تو کتب میں لکھا ہے کہ دواوین کی صورت میں

---

[39] ردالمحتار؛ج ۱۰، ص ۳۲۶

[40] ردالمحتار؛ج ۱۰، ص ۳۲۸

[41] الفتاوی التاتارخانیۃ؛ج ۱۹، ص ۱۱۲

قریب ترین دیوان والے دیت کا بوجھ اٹھائیں گے، وگرنہ عصبات اٹھائیں گے۔ لیکن جہاں تناصر کی بنیاد پر مزید کوئی گروہ نہ ہو جس پر دیت کی ادائیگی واجب ہو سکے، جیسا کہ موجودہ دور میں تناصر کی فضا انتہائی محدود ہے۔ ایک گروہ سے آگے کوئی دوسرا گروہ کسی کی امداد و نصرت نہیں کرتا۔ ایسے میں باقی دیت کیسے ادا ہو، اس حوالے سے فتاویٰ تاتارخانیہ میں مشائخ کا اختلاف ذکر کیا ہے:

قالوا: هذا الجواب إنما يستقيم في حق العربي، لأن العرب حفظوا أنسابهم فأمكنّا ايجاب العقل على أقرب القبائل من حيث النسب۔ أما لا يستقيم في حق العجمي، لأن العجم قد ضيعوا أنسابهم، فلا يمكننا ايجاب العقل على أقرب القبائل نسبا۔ فبعد ذلك اختلف المشائخ رحمهم الله۔ قال بعضهم: يعتبر المحال والقرى الأقرب فالأقرب۔ وبعضهم قالوا: يجب الباقي في بيت المال، وبعضهم قالوا: يجب الباقي في مال الجاني...[42]

اس میں تین اقوال ذکر کیے ہیں؛ قریب ترین محلے اور دیہات والوں کو شامل کیا جائے، باقی بیت المال میں سے ادا کی جائے، قاتل کے مال میں سے ادا کی جائے۔ ان تینوں میں ترجیح قائم نہیں کی۔

ہماری آج کی صورتحال میں پہلا قول ساقط ہے۔ باقی دو اقوال رہ جاتے ہیں۔ ان دونوں میں سے بیت المال میں سے ادا کرنے کا قول راجح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کا قیاس ہم اس شخص پر کر سکتے ہیں جس کی عاقلہ نہ ہو، تو اس کی دیت بیت المال سے ادا ہوتی ہے۔

شوافع اور حنابلہ کی کتب میں بھی یہ مسئلہ یونہی بیان ہوا ہے۔ 'المغنی' میں امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

مَسْأَلَةٌ: قَالَ: (وَمَنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ عَاقِلَةٌ، أَخَذَ مِنْ بَيْتِ الْمَالِ، فَإِنْ لَمْ يَقْدِرْ عَلَى ذَلِكَ، فَلَيْسَ عَلَى الْقَاتِلِ شَيْءٌ) الْكَلَامُ فِي هَذِهِ الْمَسْأَلَةُ فِي فَصْلَيْنِ: الْفَصْلُ الْأَوَّلُ: أَنَّ مَنْ لَا عَاقِلَةَ لَهُ، هَلْ يُؤَدِّي مِنْ بَيْتِ الْمَالِ أَوْ لَا؟ فِيهِ رِوَايَتَانِ. إحْدَاهُمَا: يُؤَدَّى عَنْهُ. وَهُوَ مَذْهَبُ الزُّهْرِيِّ، وَالشَّافِعِيِّ؛ لِأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَدَى الْأَنْصَارِيَّ الَّذِي قُتِلَ بِخَيْبَرَ مِنْ بَيْتِ الْمَالِ. وَرُوِيَ أَنَّ رَجُلًا قُتِلَ فِي زِحَامٍ فِي زَمَنِ عُمَرَ، فَلَمْ يُعْرَفْ قَاتِلُهُ،

---

[42] الفتاوی التاتارخانیۃ؛ ج۱۹، ص۱۱۳

فَقَالَ عَلِيٌّ لَعُمَرَ: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ لَا يُطَلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ. فَأَدَّى دِيَتَهُ مِنْ بَيْتِ الْمَالِ. وَلِأَنَّ الْمُسْلِمِينَ يَرِثُونَ مَنْ لَا وَارِثَ لَهُ، فَيَعْقِلُونَ عَنْهُ عِنْدَ عَدَمِ عَاقِلَتِهِ، كَعَصَبَاتِهِ وَمَوَالِيهِ. وَالثَّانِيَةُ: لَا يَجِبُ ذَلِكَ۔......

فَعَلَى الرِّوَايَةِ الْأُولَى، إذَا لَمْ يَكُنْ لَهُ عَاقِلَةٌ، أُدِّيَتْ الدِّيَةُ عَنْهُ كُلُّهَا مِنْ بَيْتِ الْمَالِ، وَإِنْ كَانَ لَهُ عَاقِلَةٌ لَا تَحْمِلُ الْجَمِيعَ، أُخِذَ الْبَاقِي مِنْ بَيْتِ الْمَالِ. وَهَلْ تُؤَدَّى مِنْ بَيْتِ الْمَالِ فِي دَفْعَةٍ وَاحِدَةٍ، أَوْ فِي ثَلَاثِ سِنِينَ؟ عَلَى وَجْهَيْنِ؛ أَحَدُهُمَا: فِي ثَلَاثِ سِنِينَ، عَلَى حَسْبِ مَا يُؤْخَذُ مِنْ الْعَاقِلَةِ. وَالثَّانِي: يُؤَدِّي دَفْعَةً وَاحِدَةً. وَهَذَا أَصَحُّ؛ لِأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَدَّى دِيَةَ الْأَنْصَارِيِّ دَفْعَةً وَاحِدَةً، وَكَذَلِكَ عُمَرُ، وَلِأَنَّ الدِّيَةَ بَدَلُ مُتْلَفٍ لَا تُؤَدِّيه الْعَاقِلَةُ، فَيَجِبُ كُلُّهُ فِي الْحَالِ، كَسَائِرِ بَدَلِ الْمُتْلَفَاتِ، وَإِنَّمَا أَجَّلَ عَلَى الْعَاقِلَةِ تَخْفِيفًا عَنْهُمْ، وَلَا حَاجَةَ إلَى ذَلِكَ فِي بَيْتِ الْمَالِ، وَلِهَذَا يُؤَدَّى الْجَمِيعُ۔[43]

امام نووی رحمہ اللہ کی 'المنهاج' کی شرح میں علامہ شربینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

(فإن فقد العاقل) ممن ذكر (أو) وجد، و (لم يف) ما عليه بالواجب (عقل) ذوو الأرحام إن قلنا بتوريثهم، وهو ما صححه المصنف إذا لم ينتظم أمر بيت المال كماسبق في الفرائض.... فإن انتظم عقل (بيت المال عن) الجاني (المسلم) كما يرثه، ولخبر: [أنا وارث من لا وارث له أعقل عنه وأرثه]۔ أخربه أبو داود والنسائي وصححه ابن حبان۔[44]

اس سے معلوم ہوا کہ جب کسی کی عاقلہ کے افراد دیت کی ادائیگی کے لیے ناکافی ہوں اور اس عاقلہ کے پاس مالِ عام موجود ہو... جیسا کہ ہماری صورتحال میں جماعتیں، تنظیمات اور یونین وغیرہ مالِ عام جمع رکھتی ہیں... تو اس مالِ عام میں سے باقی دیت ادا کی جائے گی۔

باقی یہ مسئلہ کہ بیت المال [یا مالِ عام] میں سے باقی ماندہ دیت یکمشت ادا کی جائے گی یا تین سالوں میں، تو اس میں گنجائش معلوم ہوتی ہے، چاہے تو یکمشت ادا کر دے یا تین سال کی مدت میں پوری کرے۔ امام ابن

---

[43] المغني؛ج۷، ص ۵۳۰

[44] مغني المحتاج؛ج۴، ص ۱۲۵

قدامہ رحمۃ اللہ علیہ کا یکمشت کو ترجیح دینا اس بنیاد پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یکمشت ادا کی تھی تو اس میں یہ احتمال غالب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تطوعاً یکمشت ادا کی ہو گی، جیسا کہ دیت کی بابت دیگر روایات میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یکمشت دیت ادا کرنا مروی ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک وہ دیت جو قتل سے ثابت ہوتی ہے، اس میں اصل تاجیل ہے۔ اسی بنیاد پر بیت المال سے ادائیگی بھی تین سال میں ہو گی، الا یہ یکمشت ادا کر دی جائے، واللہ اعلم بالصواب۔[45]

اگر عاقلہ بھی نہ ہو اور بیت المال بھی نہ ہو تو دیت قاتل کے اپنے مال میں سے واجب ہو گی۔ لیکن کیا وہ تین سال میں ادا کرنے کا پابند ہے، یا وہ ہر سال اپنے حصے کی دیت ادا کرے، چاہے جس قدر عرصہ کل دیت کی ادائیگی میں لگ جائے۔ پھر اگر وہ دیت پوری کرنے سے پہلے مر گیا تو کیا دیت کی باقی رقم ساقط ہو جائے گی، یا اس کے ترکہ میں سے ادا کی جائے گی؟ ان سوالات کا واضح جواب کتبِ حنفیہ میں نہیں موجود، اور اس مقام پر علامہ طحطاوی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سوالیہ نشان چھوڑ دیے ہیں۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

(فيؤدي في كل سنة الخ) فظاهره عدم التقييد بثلاث سنين وإلا فعلى من يكون الباقي، على أنه مع هذا هو مشكل أيضا، لأنه إذا أدى في كل سنة من عمره ثلاثة دراهم أو أربعة، فمتى تنقضي الدية، وإذا مات فهل يسقط الباقي أو يؤخذ من تركته أو من غيرها؟ لم نر من أوضح هذا المقام۔[46]

علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تقریرات میں مرنے پر ترکہ میں سے ادائیگی کو واجب لکھا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

قوله (وإذا مات فهل يسقط الباقي) لا وجه للقول بالسقوط ويظهر على هذا القول أخذ الباقي من تركته لأنه دين حل بموت من عليه، وانظر ما تقدم في آخر

---

[45] حضرت حکیم الامت نے 'بہشتی زیور' میں یہ تصریح کی ہے کہ بیت المال میں جن صورتوں میں دیت ادا ہو گی، وہ تین سال میں ہو گی۔ دیکھیے: تسہیل بہشتی زیور؛ ج ۲، ص ۱۱۶

[46] رد المحتار؛ ج ۱۰، ص ۳۳۲

الوديعة۔[47]

کتب میں موجود جزئیات اور ان اقوال سے اس مسئلے کا خلاصہ یہ معلوم ہوتا ہے:

جب نہ عاقلہ ہو اور نہ بیت المال تو

- اولاً: دیت قاتل کے اپنے مال میں لازم ہے اور ابتداءً اس پر تین سال میں ادائیگی لازم ہے، جیسا کہ اقرار کی صورت میں ہوتی ہے۔
- ثانیاً: اگر وہ ادا کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو تو ہر سال اپنے حصے کی دیت ادا کرے۔
- ثالثاً: اگر اسی دوران موت آجائے تو اس کے ترکہ میں سے باقی دیت پوری یکمشت ادا کی جائے۔
- رابعاً: اگر ترکہ میں سے پوری نہ ہو، تو باقی اس سے ساقط ہو گی۔

اوپر جہاں عاقلہ کی بنیاد نسب پر ہے، جیسے قبیلے اور برادریاں تو ایسے میں دیت ان کے عصبات سے وصول کی جائے گی، غیر عصبات سے وصول نہیں کی جائے گی۔

اور ہر ایک صورت میں عورتوں، بچوں، پاگل اور فقیر سے وصول نہیں کی جائے گی۔

یہ تمام احکام جو اس فصل میں بیان ہوئے ہیں، وہ دار الاسلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ رہ گئے دار الحرب میں قتل کے احکام تو وہ فصلِ چہارم میں بیان ہوں گے۔

[47] تقریرات الرافعي علی حاشیۃ ابن عابدین؛ ج ۲، ص ۳۴۱

فصل سوم: دار الاسلام میں قصاص و دیت کی سزاؤں کی تنفیذ سے متعلق احکام

مذکورہ بالا قتل کے معاملات میں قصاص اور دیت کی سزائیں شریعت نے مقرر کی ہیں، البتہ انسانوں میں ان سزاؤں کو لازم کرنے کے لیے شریعت نے پورا طریقِ کار وضع کیا ہے۔ انھی سزاؤں کی تنفیذ کے لیے حاکم کے نصب اور قاضیوں کی تقرری کو واجب کیا ہے۔ قتل کے معاملات میں فیصلہ اور انسانوں پر سزاؤں کا لزوم مسلمان حاکم کے اقتدار و قوت اور مسلمان قاضی کے فیصلے سے ہوتا ہے۔ قصاص اور دیت کا یہی معاملہ ہے۔ تاہم کیا قتل کا ہر فیصلہ ...چاہے وہ قصاص کی شکل میں ہو یا دیت کی... اس کے لیے حاکم یا قاضی کا فیصلہ ضروری ہے۔ اس حوالے سے کتب میں تفصیل ہے۔

مبحث اول: قصاص کی تنفیذ میں حاکم اور قاضی کی شرط

بیشتر فقہاء نے قصاص کی تنفیذ کے معاملے کو حاکمِ مسلم اور قاضی کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ یعنی اس وقت تک قصاص کی سزا کی تنفیذ جائز نہ ہو گی جب تک کہ قاضی یا حاکم کے ذریعے تنفیذ نہ ہو۔ جب تک قاضی شرعی قتل کے معاملے میں قصاص کا فیصلہ نہ دے دے اور حاکمِ مسلم کی موجودگی یا اس کی اجازت نہ ہو تو اولیائے مقتول کے لیے قصاص کی از خود تنفیذ جائز نہیں۔ شوافع اور حنابلہ کی کتب میں یہ شرط مطلقاً عائد کی گئی ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ 'المنہاج' میں لکھتے ہیں:

ولا يستوفى قصاص إلا بإذن الإمام۔[48]

امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ قاضی ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے 'المغنی' میں لکھتے ہیں:

قال القاضي: ولا يجوز استيفاء القصاص إلا بحضرة السلطان۔[49]

---

[48] مغني المحتاج؛ ج۴، ص ۵۵

[49] المغني؛ ج۷، ص ۶۶۴

احناف نے اس مسئلے میں کچھ تفصیل بیان کی ہے۔ احناف کے نزدیک بھی قتل کے معاملات میں سزا کا تعین قاضی شرعی کے فیصلے سے ہوتا ہے، اور قتلِ عمد میں قصاص کا فیصلہ بھی قاضی ہی کرتا ہے۔ تاہم یہ شرط مطلق نہیں ہے، کہ ہر حال میں عائد ہوتی ہے۔

فتاویٰ تاتارخانیہ میں لکھا ہے:

وفي اليتيمة: ذكر قاضي القضاة في كتاب الدية أن الإمام شرط في استيفاء القصاص، قال رحمه الله: وهكذا مذهب أهل الأصول، ويستوي بينه وبين الحدود، ومذهب الفقهاء أنه لا يشترط...

م[50]: وإذا قتل الرجل عمدا وله ولي واحد فله أن يقتل القاتل قصاصا، قضى القاضي أولم يقضي۔[51]

یہی بات دوسری کتبِ احناف میں بھی لکھی ہے۔ احناف کے نزدیک قصاص کے لیے امام کی شرط نہیں ہے۔ بلکہ قصاص لینے کے حقدار اولیائے مقتول دو صورتوں میں از خود قصاص لے سکتے ہیں۔

- پہلی صورت: جب مقتول کا صرف ایک ہی ولی ہو تو اب چاہے قاضی نے قصاص کا فیصلہ سنایا ہے یا نہیں سنایا، یہ ولی قاتل کو قتل کر سکتا ہے، جیسا کہ سابقہ عبارت میں درج ہے۔
- دوسری صورت: جب اولیائے مقتول میں سے کسی نے بھی قتلِ عمد میں قاتل کو معاف نہ کیا ہو، تو کوئی بھی ولی از خود قاتل کو قتل کر دے تو اس پر کوئی ضمان نہیں۔

علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ میں لکھا ہے:

سئل عن رجل قتل رجلا عمدا وثبت عليه القتل، ثم إن ولي المقتول قتله قبل أن يقضى عليه بالقتل، هل عليه ضمان بسبب ذلك أم لا؟ فأجاب: لا ضمان عليه بسبب ذلك لأنه استوفى حقه۔[52]

---

[50] مرتبِ فتاویٰ تاتارخانیہ نے م کی علامت کتاب محیط برھاني کے لیے استعمال کی ہے۔

[51] الفتاوی التاتارخانیۃ؛ ج۱۹، ص ۱۲۱

[52] فتاوی ابن نجیم بھامش الفتاوی الغیاثیۃ؛ ص ۱۸۰

تاہم یہ سمجھنا چاہیے کہ احناف کا قصاص میں امام کی شرط عائد نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قاتل سے قصاص لینے کے معاملے میں اولیائے مقتول کو کھلی آزادی ہے کہ وہ فیصلے کے لیے قاضی کے پاس سرے سے نہ جائیں اور از خود فیصلہ کر کے قاتل کو قتل کر دیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ کیونکہ کسی بھی قتل کے معاملے میں پہلے تو یہ ثابت ہونا ضروری ہے کہ آیا قتلِ عمد تھا یا خطا۔ اگر یہ طے نہ ہو تو اولیائے مقتول جب چاہیں کسی قتل کو عمد بنا دیں، حالانکہ حقیقت میں وہ خطا سے واقع ہوا ہو۔ ایسی حالت میں جو کوئی قصاص لے گا، وہ خود بھی ناجائز کام کرے گا اور اس پر قضا سے قصاص یا دیت کی سزا عائد ہو سکتی ہے۔ احناف نے جو دو صورتیں مستثنیٰ کی ہیں، وہ اسی وقت ہیں جبکہ قاتل کا مقتول کو عمداً قتل کرنا اظہر من الشمس ہو اور تمام لوگوں پر ثابت ہو۔ اور اولیائے مقتول کے قتل کر دینے کے بعد جب قاضی کے پاس معاملہ اٹھے تو وہاں بھی ثبوت سے ثابت ہو جائے کہ عمد کی وجہ سے اولیائے مقتول کا قصاص لینا جائز تھا، اس وقت اولیائے مقتول کی جان بخشی ہو گی۔

وگرنہ اگر اولیائے مقتول میں سے کسی ایک نے بھی معاف کر دیا ہو تو دوسرے ولی کا قصاص لینا ناجائز ہے۔ اگر کسی وارث کے معاف کرنے کے باوجود کسی دوسرے وارث نے قاتل کو قصاص میں قتل کر دیا، تو اگر قصاص لینے والے کو معلوم تھا کہ کسی ایک وارث کا معاف کرنا بھی مسقطِ قصاص ہے تو قتل کرنے والے وارث سے قصاص لیا جائے گا۔ اور اگر معلوم نہ تھا تو اس پر قصاص نہ ہو گا، بلکہ اس کے مال میں سے دیت لازم آئے گی۔

اگر کسی اجنبی نے قاتل کو قتل کر دیا، تو اولیائے مقتولِ اول کا حق ساقط ہو جائے گا اور اس اجنبی کو قتلِ عمد کی صورت میں قصاص میں قتل کیا جائے گا اور خطا کی صورت میں اس کی عاقلہ اولیائے مقتولِ ثانی کو دیت ادا کرے گی۔ الا یہ کہ کسی ولی نے اجنبی کو امر کیا ہو اور اولیائے مقتول کی موجودگی میں اجنبی قاتل کو قتل کرے۔

امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الأصل میں لکھا ہے:

وإذا كان الدم بين اثنين فعفا أحدهما ثم قتل الآخر عمدا علم يعلم بالعفو، أوعلم بالعفو ولم يعلم أن الدم حرم بالعفو، فعليه الدية كاملة في ماله. يحسب له من ذلك نصف الدية حصته من دم المقتول الأول، ويؤدي النصف۔ وكذلك لو كان

قتله بعد ما علم بالعفو عمدا فإن عليه الدية في ماله، يحسب له من ذلك نصف الدية، ولا قود عليه، إلا أن يكون فقيها يعلم أن ليس له أن يقتل بعد العفو، فإن كان كذلك قتل به، وهذا قول أبي حنيفة وأبي يوسف ومحمد۔...
ولو قتله غير الولي بغير أمر الولي عمدا أو خطأ، بطل دم الأول، ولا حق لولي الأول، ويكون على القاتل الآخر القصاص في العمد، وعلى العاقلة الدية في الخطأ۔ وإن قتله فقال الولي: أنا كنت أمرته، ولم يكن عليه بذلک بينة فإن هذا والأول سواء في القياس، إلا أن يعلم أن الولي أمره، فلا يكون عليه قصاص ولا دية۔[53]

مبحث دوم: قصاص و دیت کی تنفیذ میں قاضی کا فیصلہ

قتل کے معاملے میں فیصلے کا بنیادی طریقہ شریعت نے قاضی کے فیصلے کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ قاتل اور اولیائے مقتول کے دو فریقوں کے درمیان بغیر مقدمہ چلائے سزا کا تعین ناممکن ہے۔ جب تعین ہو گا تو اس کی تنفیذ ہو گی۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ قتل کا معاملہ انسانی حقوق سے تعلق رکھتا ہے۔ قتل کے سبب ہونے والی مقتول کی حق تلفی کے ازالہ کے لیے قصاص اور دیت کی سزا مقرر ہوئی ہے، تاکہ قصاص کے ذریعے ورثائے مقتول کا دل ٹھنڈا ہو اور دیت کے ذریعے ورثائے مقتول اپنا حق وصول کریں۔ سو جب تک قاضی کے پاس مقدمہ نہ آئے تو فیصلہ کیسے ممکن ہو گا۔
قتل کے معاملے میں قاضی سزا کی تعین میں درج ذیل احکام کا پابند ہوتا ہے:

- قاتل پر قتل ثابت کرنے کے لیے دو عادل مرد گواہوں کی گواہی ضروری ہے، اور گواہی بھی ایک سی ہو۔ اگر باہم متعارض ہوں تو قبول نہیں کی جائیں گی۔ درمختار میں لکھا ہے:

(وإن اختلف شاهدا قتل في الزمان أو في المكان أو في آلته، أو قال أحدهما قتله بعصا وقال الآخر لم أدر بماذا قتله، أو شهد أحدهما على معاينة القتل والآخر على

---

[53] کتاب الأصل؛ ج٦، ص ۵۹۲

إقرار القاتل به بطلت) لأن القتل لا يتكرر۔[54]

- قتل کے معاملے میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں، سوائے اس صورت میں کہ ایسی جگہ قتل کا واقعہ ہو جائے جہاں صرف عورتیں ہوں تو 'دیت' کے ثبوت کے لیے صرف عورتوں کی گواہی بھی معتبر ہو گی۔[55]
- اگر قاضی کے سامنے دو گواہ کسی شخص کے قتل پر گواہی دیں، لیکن یہ نہ بتا سکیں کہ قتل کس کیفیت میں ہوا اور کس آلے سے ہوا۔ تو چونکہ قتل کی قِسم متعین نہیں ہو سکی [گو نفسِ قتل ثابت ہو گیا]، اس لیے قصاص ساقط ہو جائے گا، البتہ استحساناً قاتل کے مال میں دیت کو لازم قرار دیا جائے گا۔ در مختار میں لکھا ہے:

(ولو شهدا) بقتله (وقالا: جهلنا آلته تجب الدية في ماله) في ثلاث سنين۔ شرنبلالية۔ استحسانا حملا على الأدنى وهو الدية وكانت في ماله، لأن الأصل في الفعل العمد۔[56]

- احناف کے نزدیک قتل میں دیت کا وجوب قاضی کے فیصلے پر مرتب ہوتا ہے۔ اگر قاضی کا فیصلہ نہ ہو تو قاتل یا عاقلہ پر دیت واجب نہیں ہوتی۔ کیونکہ قتل کی اصل سزا قصاص ہے، قصاص اسی وقت دیت میں بدلے گی جب قاضی قتل کے شبہ عمد یا خطا ہونے کا فیصلہ دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دیت کی ادائیگی کی مدت کا آغاز احناف کے یہاں قاضی کے فیصلے سے ہوتا ہے، نہ کہ مقتول کی موت سے۔ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ 'المبسوط' میں لکھتے ہیں:

وإذا قتل الرجل خطأ فلم يرفع إلى القاضي حتى مضت سنون ثم رفع إليه فإنه يقضي بالدية على عاقلته في ثلاث سنين من يوم يقضي لأن ثبوت الأجل يبنى على وجوب المال والمال إنما يجب بقضاء القاضي فأما قبل القضاء فالمال ليس

---

[54] رد المحتار؛ ج ۱۰، ص ۲۲۶

[55] تسہیل بہشتی زیور؛ ج ۲، ص ۲۱۲

[56] رد المحتار؛ ج ۱۰، ص ۲۲۶

بواجب لأن ضمان المتلفات يكون بالمثل بالنص ومثل النفس نفس إلا أنه إذا رفع إلى القاضي فيتحقق العجزعن استيفاء النفس لما فيه من معنى العقوبة وتحول الحق بقضائه إلى المال۔[57]

مبحث سوم: تحکیم کے ذریعے فیصلہ اور سزا کی تنفیذ

انسانوں کے باہمی منازعات کے حل کا ایک طریقہ شریعت میں 'تحکیم' بھی ہے۔ تحکیم کا مطلب یہ ہے کہ دو فریق کسی ایک شخص کو کسی خاص معاملے میں اپنے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے ثالث بنالیں۔ اب وہ ثالث جسے شریعت کی اصطلاح میں 'حَکَم' یا 'محکَّم' کہا جاتا ہے، فریقین کے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور وہ فیصلہ ان پر نافذ العمل ہوتا ہے۔ اس طریقِ کار کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کی درج ذیل آیت میں بیان فرمایا ہے:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا﴾ [النساء:35]

آیتِ بالا میں میاں بیوی کے باہم جھگڑے میں فیصلہ کرنے کے حوالے سے حکم نازل ہوا ہے، کہ جب میاں بیوی کا جھگڑا بڑھ جائے تو اس کے تصفیہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ تحکیم کے ذریعے معاملہ حل کرلیا جائے۔ تحکیم کی تعریف 'معین الحکام' میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

ومعناه أن الخصمين إذا حكما بينهما رجلا وارتضياه لأن يحكم بينهما فإن ذلك جائز بالكتاب والسنة وإجماع الأمة لأنا متى لم نجز التحكيم لضاق الأمر على الناس لأنه يشق على الناس الحضور إلى مجلس الحكم فجوزنا التحكيم للحاجة۔[58]

تحکیم کا حکم بھی قاضی کے حکم کی طرح نافذ ہوتا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ قاضی کی تقرری حاکم کی طرف سے ہوتی ہے، اس لیے اس کا دائرہ اختیار عام ہوتا ہے۔ اس کے برعکس حَکَم کا دائرہ بس فریقین تک محدود ہوتا ہے

---

[57] المبسوط؛ج۲۷،ص۱۲۸

[58] معین الحکام؛ص۲۷

جنھوں نے اسے اپنا ثالث بنایا ہے۔ باقی حَکَم کے لیے وہی شرائط ہیں جو قاضی کے لیے ہوتی ہیں۔ یعنی حَکَم وہی شخص متعین ہو سکتا ہے جس میں قاضی بننے کی اہلیت موجود ہو۔ اور حَکَم کا وہی فیصلہ نافذ ہوتا ہے جو شریعت کے مطابق ہو۔ فیصلہ کرنے کا طریقِ کار بھی وہی ہوگا جو قاضی اختیار کرتا ہے، جیسے ثبوت مانگنا، شہادتیں سننا، قسم اٹھوانا، وغیرہ۔

تحکیم سے کن معاملات میں فیصلہ ہوتا ہے؟ کیا قصاص میں تحکیم سے فیصلہ نافذ ہوگا

قاضی تو ہر قسم کے تنازعات کا فیصلہ کرتا ہے، البتہ حکم کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ تحکیم سے وہی معاملات کا فیصلہ ہو سکتا ہے جو انسانوں کے حقوق سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے حدود کے معاملات کا فیصلہ تحکیم سے نہیں ہو سکتا ہے۔ حنابلہ کے علاوہ جمہور علمائے امت کا یہی مسلک ہے [59]۔ قصاص کے فیصلے کے حوالے سے علماء میں اختلاف ہے۔ احناف میں بھی اس حوالے سے دو آراء پائی جاتی ہیں۔ ایک رائے میں تحکیم کے ذریعے قصاص کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے، جبکہ دوسری رائے میں قصاص کا فیصلہ بھی تحکیم کے دائرے سے باہر ہے۔ بالعموم متاخرین نے دوسری رائے کو ترجیح دی ہے، تاہم کچھ نے پہلی رائے کو راجح کہا ہے۔

'معین الحکام' میں لکھا ہے:

ویصح التحکیم فیما یملکان فعل ذلك بأنفسهما وهو حقوق العباد ولا یصح فیما لا یملکان وهو حقوق الله تعالی، حتی یجوز التحکیم في الأموال والطلاق والعتاق والنکاح والقصاص وتضمین السرقة، ولا یجوز في حد الزنا والسرقة والقذف لأن التحکیم تفویض والتفویض یصح بما یملك المفوّض فیه بنفسه ولا یصح فیما لا یملك کالتوکیل، وذکر الخصاف: ولا یجوز حکم المحکّم في حد أو قصاص لأن حکم المحکم بمنزلة الصلح، فکل ما یجوز استحقاقه بالصلح یجوز التحکیم فیه وما لا

---

[59] حنابلہ کے یہاں مفتی بہ یہی ہے کہ تحکیم سے ہر اس معاملے کا فیصلہ جائز ہے جس کا فیصلہ قضا سے جائز ہے۔ البتہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قول میں قصاص، حدِ قذف، لعان اور نکاح میں نافذ نہ ہوگا۔ حنابلہ میں سے قاضی ابویعلی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں صرف اموال میں تحکیم کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے۔ دیکھیے: الإنصاف في معرفة الراجح من الخلاف؛ ص ۱۸۷۰، کشاف القناع عن متن الإقناع؛ ج ۵، ص ۲۶۹

فلا، وحد القذف والقصاص لا يجوز استيفاؤهما بالصلح وبعقد ما، فلا يجوز التحكيم فيهما۔ وذكر في الأصل أنه يجوز التحكيم في القصاص لأن التحكيم تفويض وتولية في حقهما، وإن كان صلحا في حق غيرهما، وهما يملكان استيفاء القصاص، فيصح تفويضه إلى غيرهما۔[60]

صاحب محیط برہانی نے بھی قصاص کے فیصلے کو تحکیم کے ذریعے جائز کہا ہے۔ صاحبِ معین الحکام اسی پر چلے ہیں۔ البتہ عامہ متاخرین کا فتویٰ عدمِ جواز ہے۔ شوافع میں بھی اسی طرح دونوں اقوال پائے جاتے ہیں اور ان کے یہاں بھی راجح عدمِ جواز ہے۔ قاضی سمنانی شافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب 'روضۃ القضاۃ' میں لکھتے ہیں:

واختلف أصحاب الشافعي فيما يجوز فيه التحكيم فمنهم من قال: يجوز في كل ما يتحاكم فيه الخصمان كما يجوز حكم الحاكم الذي ولاه الإمام۔ ومنهم من قال: يجوز في الأموال، فأما النكاح واللعان والقصاص وحد القذف فلا يجوز لأنها بنيت على الاحتياط، فهذا قولهم في هذا الباب۔[61]

مالکیہ بھی عدمِ جواز کے قائل ہیں، جیسا کہ علامہ ابن فرحون رحمۃ اللہ علیہ نے 'تبصرۃ الحکام' میں بیان کیا ہے۔[62]

اس بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ تحکیم کے ذریعے قصاص کے فیصلے کے حوالے سے علمائے احناف میں اختلاف ہے، اور جواز وعدمِ جواز دونوں آراء پائی جاتی ہیں۔ اس واسطے چاہیے کہ تحکیم کے معاملے میں حَکَم قصاص کا حکم جاری نہ کرے۔ تاہم اگر اس نے فیصلہ دیا اور تنفیذ کر دی تو یہ درست سمجھا جائے گا۔

ہمارے نزدیک اس لیے درست ہوا کہ مذہبِ حنفی میں ایک قول اس کی صحت کا موجود ہے، جبکہ مالکیہ میں سے علامہ ابن فرحون رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کر چھوڑی ہے کہ جن معاملات میں ان کے مطابق حَکَم کا فیصلہ جائز نہیں ہے، اگر وہ موافقِ شرع فیصلہ کر دے تو نافذ ہو گا۔ آپ لکھتے ہیں:

وحيث قلنا لا يحكم في هذه المسائل، فلو حكم فيها بغير جور نفذ حكمه، وينهى

---

60 معین الحکام؛ ص۲۸

61 روضۃ القضاۃ وطریق النجاۃ؛ ج۱، ص۷۹

62 دیکھیے: تبصرۃ الحکام، ج۱، ص۵۰

عن العود لمثله، ولو أقام ذلك بنفسه فقتل أو اقتص أو ضرب الحد أدب وزجر، ومضى ما كان صوابا من حكمه۔[63]

البتہ انھوں نے جو حکم کی تادیب کا قول اختیار کیا ہے تو مذہبِ حنفی میں ایسا نہ ہو گا۔

دیت کے معاملے میں تحکیم کا فیصلہ

ہم نے اوپر پڑھا ہے کہ تحکیم میں حکَم کا فیصلہ محدود دائرے میں نافذ ہوتا ہے اور وہ دائرہ فریقین ہیں۔ کیونکہ فریقین کی طرف سے کسی شخص کو حکَم بنانے سے اسے ان پر ولایت حاصل ہو جاتی ہے، تاہم ان کے علاوہ دوسرے انسانوں پر ولایت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے ایسا کوئی معاملہ جس کا نفاذ فریقین کے علاوہ دوسرے انسانوں پر ہوتا ہو، تو حکَم اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قتلِ شبہ عمد اور قتلِ خطا میں جبکہ قاتل اور اولیائے مقتول تصفیہ کے لیے کسی شخص کو حکم بنائیں تو وہ اپنے فیصلے سے عاقلہ پر دیت عائد نہیں کر سکتا، کیونکہ عاقلہ پر اسے ولایت حاصل نہیں ہے۔ البتہ اگر قاتل اقرار کرے تو شریعت میں بھی اس اقرار کی صورت میں دیت قاتل کے اپنے مال میں لازم آتی ہے۔ اس لیے حکم قاتل کے اقرار پر اس پر دیت لازم کر سکتا ہے۔ لیکن قتلِ شبہ عمد و خطا میں بغیر اقرار کے قتل کے ثبوت پر عاقلہ پر دیت عائد نہیں کر سکتا۔ 'معین الحکام' میں لکھا ہے:

ولا يجوز حكمه في الدم الخطأ لأن العاقلة لم ترض به وحكم المحكّم إنما ينفذ على من يرضى بحكمه، وإن قضى بالدية على القاتل لا يجوز لأن هذا الحكم مخالف للشرع، فإن الدية في قتل الخطأ على العاقلة، إلا أن يكون القاتل أقر بالقتل الخطأ فيجوز حينئذ حكمه بالدية عليه لأن ما يجب بالاعتراف لا تتحمله العاقلة وإنما يجب على المقر، وكان حكمه موافقا فنفذ۔[64]

احناف کے یہاں یہ مسئلہ متعین ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ اس مسئلے میں شوافع کے یہاں دو

---

[63] تبصرۃ الحکام؛ ج۱، ص ۵۰

[64] معین الحکام؛ ص ۲۸

اقوال پائے جاتے ہیں۔ ایک قول میں ان کے یہاں حَکَم عاقلہ پر دیت کا فیصلہ دے سکتا ہے۔ قاضی ابن ابی الدم شافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب 'ادب القضاء' میں لکھتے ہیں:

ثم اعلم أن الحكم بين المتحاكمين في التحكيم لا يتعدى إلى ثالث غير المتحاكمين إلا في مسئلة العاقلة، وهو ما إذا تحاكم إليه اثنان في قتل الخطأ، وقامت البينة على ذلک۔ وفي وجوب الدية على العاقلة وجهان:

أحدهما: لا تجب، لعدم رضاها بحكمه۔

والثاني: بلی، لأن الرضا حصل من القاتل۔

وهذا الخلاف مبني على أن الدية تجب أولا على القاتل، ثم تتحملها العاقلة عنه، أو تجب على العاقلة ابتداء۔ فإن قلنا تجب أولا على القاتل، وجبت ههنا على العاقلة۔ وإن قلنا تجب أولا على العاقلة، فلا تجب لعدم رضاهم بها۔[65]

امام ماوردی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب 'ادب القاضی' میں یہ مسئلہ یونہی بیان کیا ہے اور ائمہ شوافع کے دونوں اقوال بغیر ترجیح کے ذکر کیے ہیں۔[66]

احناف کی تعلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عاقلہ قاتل کے ہمراہ خود فریق ہو، تو اب حَکَم عاقلہ پر دیت کا فیصلہ دے سکتا ہے۔ ظاہر میں اس پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ عاقلہ تو کوئی متعین فرد کا نام نہیں ہے، عاقلہ میں سے کیا سارے افراد شامل ہوں تو تبھی فیصلہ ہو گا یا مخصوص افراد کے شامل ہونے سے پوری عاقلہ پر دیت کا فیصلہ ہو گا۔ اس حوالے سے عرض ہے کہ عاقلہ اسی صورت میں قاتل کے ہمراہ فریق بن سکتی ہے جب کہ عاقلہ کسی فرد کی ولایت میں ہو۔ ایسے میں اس ولایت کے حامل فرد کے قاتل کے ہمراہ فریق بننے سے پوری عاقلہ فریق بن جائے گی۔ جیسے قاتل کی عاقلہ کوئی قبیلہ یا جہادی جماعت ہے۔ اس قبیلے کا ایک سربراہ یا اس جماعت کا امیر ہے۔ سربراہِ قبیلہ کو اپنے قبیلے پر اور امیر جماعت کو اپنی جماعت کے افراد پر ولایت حاصل ہے۔ اب ایسے میں

---

65 أدب القضاء؛ ص ۴۳۲

66 دیکھیے: أدب القاضي؛ ج ۲، ص ۳۸۴

امیرِ جماعت جب قاتل کے ہمراہ فریق بن جائے تو اب عاقلہ پر فیصلہ ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ قاضی کے پاس اقرارِ قاتل کے ساتھ تصدیقِ عاقلہ کا بھی ہے۔ جس کے بارے میں ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ اگر قاضی کے سامنے قاتل اقرار کرلے اور عاقلہ بھی اس قتل کی تصدیق کرے تو اس صورت میں دیت عاقلہ پر ہی عائد ہوتی ہے۔ یہاں بھی یہ عاقلہ کی تصدیق اسی صورت میں ہے، جب عاقلہ پر ولایت رکھنے والا فرد یا افراد تصدیق کرلیں۔

خلاصہ کلام: قتل کے معاملے میں تحکیم کے ذریعے فیصلہ

مذکورہ بالا بحث سے درج ذیل نکات معلوم ہوتے ہیں:

- قتلِ عمد کی صورت میں تحکیم کے ذریعے فیصلہ نہیں ہونا چاہیے، تاہم اگر حکم فیصلہ کر دے تو یہ فیصلہ نافذ ہو گا۔
- قتلِ شبہ عمد اور قتلِ خطا میں تحکیم کے ذریعے اسی صورت میں فیصلہ ہو سکتا ہے جبکہ قاتل خود اقراری ہو۔ ایسے میں قاتل پر کفارہ اور اسی کے مال میں دیت واجب ہو گی۔
- قتلِ شبہ عمد اور قتلِ خطا میں قاتل کے اقرار کے علاوہ فیصلہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ عاقلہ خود قاتل کے ہمراہ فریق ہو۔ اس حال میں دیت عاقلہ پر واجب ہو گی۔

مبحث چہارم: صلح کے احکام

قتل کے معاملات کے تصفیہ کی ایک صورت شریعت میں فریقین کے درمیان صلح کرلینا بھی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اپنی بندوں پر ایک عنایت ہے کہ اس نے قتل تک کے معاملات میں انسانوں کے درمیان صلح کی اجازت دی ہے، تاکہ فریقین باہم رضامندی سے قتل تک کے معاملہ کا تصفیہ کرلیں۔ غلطی کا ارتکاب کرنے والا بھی الزامی سخت سزا سے بچ جائے اور اس موقع کو غنیمت جان کر آئندہ کے لیے ایسے اقدام سے باز رہے۔ شریعت نے اس صلح کے لیے بھی احکام بتائے ہیں، جن کے مطابق یہ صلح انجام پاتی ہے۔ یہ صلح قاتل کے انکارِ قتل اور اقرار دونوں صورتوں میں احناف کے یہاں درست ہے۔

قتلِ عمد کی صورت میں صلح

قتلِ عمد کی صورت میں اولیائے مقتول چاہیں تو قاتل کے ساتھ صلح کرلیں اور اس سے قاتل پر سے قصاص ساقط ہو جائے گا۔ یہ صلح شریعت کی مقرر کردہ دیت کی مقدار پر بھی کی جاسکتی ہے، اس سے کم اور اس سے زیادہ پر بھی کی جاسکتی ہے۔ اس مال کی ادائیگی فوری واجب ہو گی۔ سوائے اس صورت کے کہ فریقین کوئی مدت متعین کرلیں۔

فتاویٰ ہندیہ میں لکھا ہے:

وإذا اصطلح القاتل وأولياء القتيل على مال سقط القصاص ووجب المال، قليلا كان أو كثيرا، وإن لم يذكروا حالا ولا مؤجلا، فهو حال، كذا في الهداية۔[67]

قتلِ خطا اور شبہ عمد کی صورت میں صلح

قتلِ خطا اور شبہ عمد کی صورت صلح کی دو حالتیں ہیں؛ پہلی یہ ہے کہ قاضی نے فیصلہ دے دیا ہے اور دیت کی نوعیت کا تعین ہو گیا ہے۔ دوسری یہ ہے کہ ابھی تک قاضی کے پاس معاملہ نہیں گیا ہے اور نہ ہی اس نے کوئی فیصلہ دیا ہے۔ ان دونوں حالتوں میں صلح کے احکام میں فرق ہے۔

اگر ابھی تک قاضی کا فیصلہ نہیں آیا تو

- ایسی صورت میں دیت کی شریعت میں مقررہ مقدار سے زیادہ میں صلح کرنا جائز نہیں ہے، چاہے ایک ہی مجلس میں ادائیگی ہو یا اس کی ادائیگی کی مدت طے کی جائے۔
- اسی کے بقدر یا اس سے کم مقدار پر صلح کرنا جائز ہے، چاہے ایک مجلس میں ادائیگی ہو یا اس کی ادائیگی کی مدت طے کی جائے۔
- اگر مذکورہ بالا صورت میں صلح میں وقت کا تعین نہیں کیا گیا تو یہ تین سال میں واجب الادا ہو گی۔
- اگر وہ کسی ایسی متعین چیز کی ادائیگی پر صلح کرتے ہیں جو شریعت کی مقرر کردہ دیت کی نوعیتوں سے علاوہ

---

[67] الفتاوی الھندیۃ؛ ج۶، ص۲۰

ہو [جیسے گھوڑے، خچر یا کسی قسم کا سامان یا رقم] تو اب چاہے وہ کم مقدار رکھیں یا دیت کی مالیت سے زیادہ مقدار رکھیں، دونوں صورتوں میں صلح جائز ہے، لیکن ہاتھ کے ہاتھ۔ اس میں مدت کا تعین کرنا جائز نہیں ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ اپنی کتاب الاصل میں لکھتے ہیں:

وإذاجنى الرجل من أهل الإبل فقتل رجلا خطأ فصالح على أكثرمن عشرة آلاف أو أكثر من ألف دينار نسيئة أو يدا بيد فلا خير في ذلك۔ ولا أجيز أن يعطي أكثر من الدية۔ وكذلك إن كان من أهل الورق فصالح على ألفي دينار أو على أكثرمن مائة من الإبل، لأن هذا مما قد فرضت فيه الدية، فلا يجوز له أن يعطي أكثرمن صنف منها۔ ولو صالحه وهو من أهل الورق على خمسين من الإبل أجزت ذلك، وكذلك لو صالحه على أقل من ألف ديناريدا بيد أو نسيئة أجزت ذلك من قبل أن هذا قد حط عنه۔ ولو صالحه على أقل من ألف دينارنسيئة في ثلاث سنين قبل أن يقضى عليه بالدراهم، وقال: إنما صالحتك من الدم على ذلك كان جائزا، إنما أكره النسيئة إذا وجبت عليه الدراهم فصالحه منها على غيرها۔ ولو صالحه على ألف دينارمن الدم ولم يسم أجلا كان ذلك جائزا۔ وكان ذلك في ثلاث سنين، من قبل أن القتل خطأ۔[68]

فتاویٰ ہندیہ میں لکھا ہے:

فأما إذا اصطلحا قبل القضاء والرضا إن اصطلحا على مال فرض في الدية، إن كان المصالح عليه أكثر من الدية فإنه لا يجوز وإن كان يدا بيد، وإن وقع الصلح على أقل من عشرة آلاف درهم أو على أقل من ألف دينار أو على أقل من مائة من الإبل، فإنه يجوز نسيئة كان أو يدا بيد، وإن وقع الصلح على جنس آخر لم يفرض في الدية فإن كان نسيئة لا يجوز، وإن كان عينا جاز، هكذا في المحيط۔[69]

---

[68] کتاب الأصل؛ ج٦، ص ٥٦٢

[69] الفتاوی الهندية؛ ج٦، ص ٢٠

اور اگر قاضی نے فیصلہ دے دیا ہے اور دیت کی نوعیت مقرر ہو گئی ہے، تو اب

- اگر وہ دیت کی اسی نوعیت میں زیادہ مقدار پر صلح کریں تو یہ ناجائز ہے۔
- اگر وہ دیت کی اسی نوعیت میں صلح کریں، لیکن کم مقدار پر، تو چاہے وہ فوری مجلس میں ادا کریں یا مدت متعین کریں، دونوں صورتیں جائز ہیں۔ [مثلاً قاضی نے دس ہزار درہم دیت مقرر کر دی۔ اب صلح پانچ سو درہم پر ہو جائے تو یہ جائز ہے۔ چاہے ہاتھ کے ہاتھ ہو یا مدت کا تعین ہو۔]
- اگر وہ دیت کی کسی دوسری نوعیت پر صلح کریں، شریعت کی مقرر کردہ مقدار سے زیادہ پر یا کم پر، تو یہ ہاتھ کے ہاتھ میں جائز ہے۔ اس میں مدت کا تعین جائز نہیں۔ [مثلاً قاضی نے دس ہزار درہم کی دیت مقرر کر دی، اب کوئی ایک ہزار دینار یا سو اونٹوں پر صلح کر لے، تو یہ ہاتھ کے ہاتھ واجب الادا ہو گی۔]
- اگر وہ کسی ایسی متعین چیز کی ادائیگی پر صلح کرتے ہیں جو شریعت کی مقرر کردہ دیت کی نوعیتوں سے علاوہ ہو [جیسے گھوڑے، خچر یا کسی قسم کا سامان یا رقم] تو اب چاہے وہ کم مقدار رکھیں یا دیت کی مالیت سے زیادہ مقدار رکھیں، دونوں صورتوں میں صلح جائز ہے، لیکن ہاتھ کے ہاتھ۔ اس میں مدت کا تعین کرنا جائز نہیں ہے۔

فتاوی ہندیہ میں لکھا ہے:

ثم الصلح في فصل الخطأ إن كان بعد القضاء بنوع من أنواع الدية أو بعد تراضيهما على ذلك، فإن وقع على النوع الذي وقع القضاء به أووقع التراضي عليه وكان الصلح على أكثرمن الدية لايجوز، وإن وقع على أقل مما وقع به القضاء فإنه يجوز نسيئة كان أو يدا بيد۔ وإن اصطلحا على خلاف جنس المقضى به وقد صالحه على أكثر مما قضى به فإنه يجوز إلا أنه إذا كان المقضى به دراهم وقد اصطلحا على دنانير أكثر منه إنما يجوز إذا كان يدا بيد، وإن كان المصالح عليه فرسا أوحمارا أوعبدا إن كان دينا فإنه لا يجوز وإن كان عينا يجوز وإن لم يقبض في المجلس۔ وإن كان صالحه على أقل من المقضى به فإن كان المقضى به أحدهما دنانيروالآخر دراهم فإنه لا يجوز نسيئة ويجوز يدا بيد۔ وإن كان المقضى به دراهم

والمصالح عليه عرضا من العروض إن كان نسيئة لا يجوز وإن كان بعينه يجوز، سواء قبض في المجلس أولم يقبض۔[70]

تنبیہ: صلح میں مال کی ادائیگی قاتل پر واجب ہوتی ہے، الا یہ کہ قتلِ خطا کے معاملے میں عاقلہ بھی صلح میں شریک ہو

یہ مسئلہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ صلح کی صورت میں دیت یا مال کی ادائیگی قاتل پر واجب ہوتی ہے، عاقلہ پر نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صلح میں مال عقد کی وجہ سے واجب ہوتا ہے اور عقد ورثائے مقتول اور قاتل کے مابین ہوتا ہے۔ 'تبیین الحقائق میں' علامہ عثمان زیلعی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَالَّذِي وَجَبَ بِالصُّلْحِ إنَّمَا وَجَبَ بِعَقْدِهِ وَالْعَاقِلَةُ لَا تَتَحَمَّلُ مَا يَجِبُ بِالْعَقْدِ، وَإِنَّمَا تَتَحَمَّلُ مَا يَجِبُ بِالْقَتْلِ، وَكَذَا مَا لَزِمَهُ بِالْإِقْرَارِ لَا تَتَحَمَّلُهُ الْعَاقِلَةُ؛ لِأَنَّ لَهُ وِلَايَةً عَلَى نَفْسِهِ دُونَ عَاقِلَتِهِ فَيَلْزَمُهُ دُونَهُمْ۔[71]

اس تعلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر قتلِ خطا کے معاملے میں قاتل قتل کے اقرار پر اولیائے مقتول سے صلح کرتا ہے اور عاقلہ بھی قاتل کی تصدیق کر رہی ہے تو ایسے میں عاقلہ قاتل کے ہمراہ اولیائے مقتول کے ساتھ عقدِ صلح میں شریک ہے۔ اب اس استثنائی صورت میں صلح جس مقدارِ مال پر ہو گی، وہ عاقلہ پر واجب ہو گا۔ جس طرح اقرارِ قاتل کے معاملے کا حکم اوپر بیان ہوا ہے۔

---

[70] الفتاوی الھندیۃ؛ ج٦، ص٢٠

[71] تبیین الحقائق؛ ج٦، ص١٣٨

فصل چہارم: دار الحرب میں مقیم مسلمان کی جان ومال کی عصمت کا بیان

مبحث اول: دار الاسلام اور دار الحرب کی تعریف

اسلام کے بیشتر احکامات بالخصوص سزاؤں کی تنفیذ وغیرہ اقتدار اور قدرت سے وابستہ ہیں۔ پس جہاں مسلمانوں کے پاس اقتدار ہو اور وہ وہاں اپنی قدرت کے ساتھ اسلامی احکام جاری کریں تو شریعت کی نظر میں یہ علاقہ 'دار الاسلام' کہلاتا ہے۔ اور جہاں کفار کے پاس اقتدار ہو اور وہاں کفری احکام نافذ ہوں تو وہ علاقہ 'دار الحرب' کہلاتا ہے۔

شریعتِ اسلامیہ کی نظر میں دنیا کی اس تقسیم کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ معلوم ہو جائے کہ دنیا کا کتنا علاقہ اسلام کے تابع ہے اور کتنا علاقہ کفر کے تابع ہے، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ اسلام اور کفر باہم مل جل کر رہیں۔ بلکہ اسلام کی اتھارٹی اور اقتدار کفر کی اتھارٹی اور اقتدار سے واضح و ممیز ہو جائے۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ اہلِ اسلام اور اہلِ کفر کے باہمی معاملات اور تعامل کے لیے حد بندی ہو جائے۔ تیسری حکمت یہ ہے کہ جو مسلمان کفر کی اتھارٹی میں رہتے ہیں، ان کے حوالے سے... ان کی زمینی صورتحال کی بنا پر... شریعت کے بعض احکامات مختلف ہیں، سو دار کی تقسیم سے یہ احکامات الگ الگ واضح ہو جائیں۔

دار الاسلام اور دار الحرب کی جو تعریف اوپر بیان کی گئی ہے، اس کے حوالے سے علماء میں بالعموم اختلاف نہیں ہے[72]۔

---

[72] یہاں بالعموم کا لفظ اس لیے لکھ دیا کہ احناف اور حنابلہ کے اسی مفہوم کے بہ کثرت اقوال ملتے ہیں، مالکیہ میں سے متقدمین کا مسلک اسی کے موافق ملتا ہے۔ البتہ شوافع کے یہاں اس میں اختلاف ہے، کوئی ایک مفتی بہ قول نہیں ملتا۔ بعض کا قول موافق ملتا ہے، بعض دیگر کا نہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے یہاں اس موضوع کو نہیں چھیڑا جا رہا۔ جو چاہے وہ مجاہد عالمِ دین شیخ ابو منذر الساعدی کی کتاب 'وبل الغمامة في أحكام الإمامة' اور مجاہد عالمِ دین، ہمارے استاد شیخ ابو یحییٰ اللیبی شہید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب 'منة الخبير في حكم إقامة الحدود في دار الحرب والتعزير' کی مراجعت کر سکتا ہے۔

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ 'المبسوط' میں لکھتے ہیں:

فكل موضع ظهر فيه حكم الشرك فالقوة في ذلك الموضع للمشركين فكانت دار حرب , وكل موضع كان الظاهر فيه حكم الإسلام فالقوة فيه للمسلمين۔[73]

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین [یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد] رحمۃ اللہ علیہما کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دار الحرب اسی وقت دار الاسلام بنتا ہے جب غلبے کے بعد اجرائے احکامِ اسلام ہو جائے۔ امام کاسانی رحمۃ اللہ علیہ 'بدائع' میں لکھتے ہیں:

لا خلاف بين أصحابنا في أن دار الكفر تصير دار إسلام بظهور أحكام الإسلام فيها۔[74]

البتہ دار الاسلام کے دار الحرب بننے میں امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف ہے۔ امام کاسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

واختلفوا في دار الإسلام , إنها بماذا تصير دار الكفر؟ قال أبو حنيفة : إنها لا تصير دار الكفر إلا بثلاث شرائط , أحدها : ظهور أحكام الكفر فيها والثاني : أن تكون متاخمة لدار الكفر والثالث : أن لا يبقى فيها مسلم ولا ذمي آمنا بالأمان الأول , وهو أمان المسلمين . وقال أبو يوسف ومحمد - رحمهما الله : إنها تصير دار الكفر بظهور أحكام الكفر فيها.[75]

پس جب کسی خطے میں اسلامی احکام نافذ ہوں، تو وہ دار الاسلام ہے اور جہاں کفر کے احکام جاری ہوں تو وہ دار الحرب ہے۔ البتہ اگر کسی دار الاسلام پر کفار غالب ہو جائیں تو امام صاحب کے نزدیک صرف اجرائے احکامِ کفر کی وجہ سے ہم اس کے دار الحرب ہونے کا فیصلہ نہیں کریں گے، بلکہ دو مزید شرائط دیکھیں گے۔ ایک یہ کہ وہ علاقہ کسی طرف سے دار الاسلام سے منسلک نہ ہو، اور دوسری یہ ہے کہ وہاں مسلمان اور ذمی اپنی سابقہ امان کے ساتھ زندگی گزارنے سے قاصر ہو جائیں۔ امام صاحب کی تینوں شرائط کا مقصد اس بات کی تاکید کرنا ہے کہ جب کفر کا غلبہ تمام ہو جائے تو اس وقت دار الاسلام کو دار الحرب قرار دیا جائے اور وہ ان تینوں شرائط کے

---

[73] المبسوط؛ ج ۱۰، ص ۱۱۴

[74] بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع؛ ج ۹، ص ۵۱۹

[75] أيضًا

پائے جانے پر ہو گا۔

یہاں یہ واضح رہے کہ بعض معاصر علماء نے دار الاسلام کی تعریف میں سے احکامِ اسلام کے غلبے کو خارج کر دیا ہے اور فقط یہ تعریف رکھی ہے کہ جس علاقے میں مسلمان غالب ہوں اور قوت میں ہوں تو وہ دار الاسلام ہے، چاہے وہاں کے حکمران کفر کے احکام جاری کریں۔ یہ تعریف متقدمین علمائے امت کے خلاف ہے، اسی لیے در خورِ اعتناء نہیں ہے۔ کیونکہ جب مسلمان کسی علاقے پر غالب ہو کر وہاں کفری احکام جاری کریں اور اسلامی احکام کو بالقوۃ روکیں اور نافذ نہ ہونے دیں، تو ایسا کرنے والے مسلمان ہی نہ رہیں گے، اور ایسا علاقہ تعریف کے اعتبار سے کسی طور دار الاسلام نہ ہو گا، بلکہ دار الحرب قرار دیا جائے گا۔

مبحث دوم: دار الحرب کے مسلمان کی جان کی عصمت

جان کی عصمت کی دو نوعیتیں ہیں؛ ایک عصمت مؤثمہ اور دوسری عصمتِ مقوّمہ۔ عصمتِ مؤثمہ سے مراد وہ عصمت ہے جس کے سبب کسی جان کو تلف کرنے پر اخروی گناہ لازم آتا ہے، جبکہ عصمتِ مقوّمہ وہ عصمت ہے جس کے سبب دنیا میں جان کے تلف پر سزا لازم آتی ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک عصمتِ مؤثمہ 'اسلام' سے ثابت ہو جاتی ہے، لیکن عصمتِ مقوّمہ محض اسلام سے ثابت نہیں ہوتی ہے، بلکہ یہ دار الاسلام سے وابستہ ہونے پر آتی ہے۔ یعنی احناف کے نزدیک مسلمان جہاں بھی ہے، بلاشبہ اس کا قتل حرام ہے اور گناہ ہے۔ لیکن اس کے قتل پر سزا اسی وقت لازم ہو گی جب وہ مسلمان دار الاسلام سے وابستہ ہو جائے۔ اگر کوئی شخص دار الحرب میں مسلمان ہوا اور دار الاسلام کی طرف اس نے ہجرت نہیں کی، ایسے میں اگر کوئی مسلمان اسے دار الحرب میں قتل کر دے تو اس مسلمان پر نہ قصاص ہے اور نہ دیت، کیونکہ اس مسلمان کو عصمتِ مقوّمہ حاصل نہ تھی۔

رد المحتار میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قَوْلُهُ (مَحْقُونِ الدَّمِ[76]) الْحَقْنُ هُوَ الْمَنْعُ: قَالَ فِي الْمُغْرِبِ حَقَنَ دَمَهُ إذَا مَنَعَهُ أَنْ يُسْفَكَ. وَاحْتَرَزَ بِهِ عَنْ مُبَاحِ الدَّمِ كَالزَّانِي الْمُحْصَنِ وَالْحَرْبِيِّ وَالْمُرْتَدِّ، وَالْمُرَادُ الْحَقْنُ الْكَامِلُ، فَمَنْ أَسْلَمَ فِي دَارِ الْحَرْبِ فَقَدْ صَارَ مَحْقُونَ الدَّمِ عَلَى التَّأْبِيدِ، وَلَا يُقْتَصُّ مِنْ قَاتِلِهِ هُنَاكَ؛ لِأَنَّ كَمَالَ الْحَقْنِ بِالْعِصْمَةِ الْمُقَوِّمَةِ وَالْمُؤَثِّمَةِ وَبِالْإِسْلَامِ حَصَلَتْ الْمُؤَثِّمَةُ دُونَ الْمُقَوِّمَةِ؛ لِأَنَّهَا تَحْصُلُ بِدَارِ الْإِسْلَامِ، أَفَادَهُ فِي الْكِفَايَةِ۔[77]

اس بات کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ﴾ [النساء:92]

اس آیت میں پہلے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمان کے قتلِ خطا کا حکم بیان فرمایا ہے کہ اس کے بدلے دیت اور کفارہ دونوں لازم آئیں گے۔ اس کے بعد اس مسلمان کے قتل کا حکم بیان فرمایا ہے جو کفار میں رہتا ہو کہ قتلِ خطا کی صورت میں اس کے بدلے قاتل پر صرف کفارہ لازم ہے۔ یہاں کفار میں رہنے والے مسلمان سے مراد دار الحرب میں رہنے والا مسلمان ہے۔

احناف ہی کے مثل مالکیہ کا مسلک ہے[78]۔ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک محض اسلام سے عصمت مؤثمہ اور مقومہ دونوں ثابت ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان کے یہاں مسلمان... چاہے دار الاسلام میں ہو یا دار الحرب میں... اس کے قتلِ خطا کی صورت میں دیت اور کفارہ لازم آتا ہے، جبکہ قتلِ عمد کی صورت میں قصاص لازم آتا ہے۔ البتہ اگر کسی مسلمان کے تمام رشتہ دار کافر ہیں، وہ اکیلا مسلمان ہے، تو اس کے قتل کی صورت میں صرف کفارہ لازم آئے گا... چاہے اس کا قتل دار الاسلام میں ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ اس کے ورثاء کفار ہیں جنھیں کسی قسم کی دیت

---

[76] در مختار کی مکمل عبارت یہ ہے: [يجب القود أي القصاص بقتل كل مَحْقُونِ الدَّمِ]

[77] رد المحتار؛ ج ۱۰، ص ۱۶۲

[78] دیکھیے: أحكام القرآن لابن العربي المالكي؛ ج ۱، ص ۶۰۲۔ امام ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ضرور بیان فرمایا ہے، لیکن خود اس سے اتفاق نہیں فرمایا، بلکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو ترجیح دی ہے۔

نہیں دی جائے گی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ بالا آیت کی بھی یہی تفسیر کی ہے۔ حنابلہ کا مفتی بہ قول بھی یہی ہے، اگرچہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مثل بھی موجود ہے۔[79]

اس معاملے میں راجح مسلک احناف کا ہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے جب ایک جنگ میں جہینہ قبیلے کے اس شخص کو قتل کر دیا تھا جس نے کلمہ پڑھ لیا تھا تو اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما پر صرف کفارہ لازم کیا تھا، دیت نہیں۔[80]

باقی اس مسلمان کا معاملہ جس کے سب رشتہ دار کافر ہیں، اگر وہ دار الاسلام کا باشندہ ہے تو اس کے قاتل پر عمد کی صورت میں قصاص اور خطا کی صورت میں دیت اور کفارہ دونوں لازم آئیں گے۔ کیونکہ اس مسلمان کے مسلمان رشتہ دار نہ ہونے کی وجہ سے قاتل کی سزا تو کم نہ ہو گی۔

مبحث سوم: دار الحرب میں دار الاسلام کے مسلمان کے قتل کا معاملہ

اوپر جو حکم بیان ہوا ہے، وہ اس مسلمان کا ہے، جو دار الحرب میں اسلام لایا اور دار الاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی۔ اس کے لیے بعض کتب میں مسلمِ حربی کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ لیکن جو مسلمان دار الاسلام سے دار الحرب جائیں اور وہاں کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کر دے، تو اس کا حکم اوپر بیان کردہ حکم سے مختلف ہے، کیونکہ دار الاسلام کا مسلمان عصمتِ مؤثمہ کے ساتھ عصمتِ مقومہ کا بھی حامل ہے۔ ایسے مسلمان کے لیے بعض کتب میں مسلمِ اصلی کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس کی بابت ہدایہ میں لکھا ہے:

(وَإِذَا دَخَلَ مُسْلِمَانِ دَارَ الْحَرْبِ بِأَمَانٍ فَقَتَلَ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ عَمْدًا أَوْ خَطَأً فَعَلَى الْقَاتِلِ الدِّيَةُ فِي مَالِهِ وَعَلَيْهِ الْكَفَّارَةُ فِي الْخَطَإِ) أَمَّا الْكَفَّارَةُ فَلِإِطْلَاقِ الْكِتَابِ، وَأَمَّا

---

[79] دیکھیے: المغنی؛ ج۷، ص ۴۳۵

[80] یہ حدیث صحیحین سمیت بیشتر کتبِ حدیث میں مروی ہے، البتہ حدیث کے الفاظ میں دیت و کفارہ وغیرہ کا ذکر نہیں ملتا، سوائے ایک روایت کے جسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور اس میں صرف کفارہ کی ادائیگی کا ذکر ہے۔ دیکھیے: معالم التنزیل؛ ص ۳۲۸

الدِّيَةُ فَلِأَنَّ الْعِصْمَةَ الثَّابِتَةَ بِالْإِحْرَازِ بِدَارِ الْإِسْلَامِ لَا تَبْطُلُ بِعَارِضِ الدُّخُولِ بِالْأَمَانِ، وَإِنَّمَا لَا يَجِبُ الْقِصَاصُ؛ لِأَنَّهُ لَا يُمْكِنُ اسْتِيفَاؤُهُ إِلَّا بِمَنَعَةٍ، وَلَا مَنَعَةَ دُونَ الْإِمَامِ وَجَمَاعَةِ الْمُسْلِمِينَ، وَلَمْ يُوجَدْ ذَلِكَ فِي دَارِ الْحَرْبِ، وَإِنَّمَا تَجِبُ الدِّيَةُ فِي مَالِهِ فِي الْعَمْدِ؛ لِأَنَّ الْعَوَاقِلَ لَا تَعْقِلُ الْعَمْدَ؛ وَفِي الْخَطَإِ لِأَنَّهُ لَا قُدْرَةَ لَهُمْ عَلَى الصِّيَانَةِ مَعَ تَبَايُنِ الدَّارَيْنِ وَالْوُجُوبُ عَلَيْهِمْ عَلَى اعْتِبَارِ تَرْكِهَا.

یعنی دار الاسلام کے وہ مسلمان جو امان لے کر دار الحرب جائیں تو ان کا حکم دار الحرب کے مسلمان سے مختلف ہے کیونکہ ان کی دار الاسلام سے وابستگی ثابت ہے، جبکہ دار الحرب میں داخلہ عارضی ہے۔ چنانچہ ان میں سے مسلمان کے قتل کے وہی احکام ہیں جو دار الاسلام میں مسلمان کے قتل کے احکام ہیں، سوائے دو باتوں کے:

اول: دار الحرب میں قتلِ عمد کے عوض قصاص لازم نہیں ہو گا، کیونکہ قصاص کی تنفیذ و لزوم کے لیے اسلام کا اقتدار چاہیے، جو دار الحرب میں مفقود ہے۔

دوم: قتلِ عمد و خطا میں دیت لازم ہو گی، وہ بھی قاتل کے اپنے مال میں، عاقلہ پر نہیں۔ کیونکہ اختلافِ دار کی وجہ سے عاقلہ کا اختیار دار الحرب میں قاتل پر نہیں رہتا، جہاں یہ قاتل واقع ہوا۔

اس کی کچھ مزید تفصیل ہم آئندہ ذکر کریں گے۔ یہاں صرف اس فرق کو واضح کرنا تھا کہ دار الحرب میں موجود مسلمان کے قتل کے حکم کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ آیا مقتول اصلاً ہی دار الحرب کا باشندہ ہے یا دار الاسلام سے گیا ہوا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں حکم مختلف ہو گا۔

ایک جزئیہ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کا اختلاف ہے، وہ ہے مسلمان قیدی کا معاملہ۔ دار الاسلام کا مسلمان اگر کفار کی قید میں چلا جائے اور وہ اسے دار الحرب لے جائیں، اب اگر اسے قتل کر دیا جائے، تو صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کے مطابق اس کا حکم دار الاسلام سے وابستگی کی وجہ سے مسلمِ اصلی والا ہو گا۔ لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قید ہونے کی وجہ سے یہ کفار کا مقہور ہو گیا ہے اور یہ حکم میں اسی مسلمان کی طرح ہو گیا ہے جو مسلمِ حربی ہے۔ ہدایہ میں لکھا ہے:

(وَإِنْ كَانَا أَسِيرَيْنِ فَقَتَلَ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ أَوْ قَتَلَ مُسْلِمٌ تَاجِرٌ أَسِيرًا) فَلَا شَيْءَ عَلَى الْقَاتِلِ إِلَّا الْكَفَّارَةُ فِي الْخَطَإِ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ، وَقَالَا: (فِي الْأَسِيرَيْنِ الدِّيَةُ فِي الْخَطَإِ

وَالْعَمْدِ)؛ لِأَنَّ الْعِصْمَةَ لَا تَبْطُلُ بِعَارِضِ الْأَسْرِ كَمَا لَا تَبْطُلُ بِعَارِضِ الِاسْتِئْمَانِ عَلَى مَا بَيَّنَّاهُ، وَامْتِنَاعُ الْقِصَاصِ: لِعَدَمِ الْمَنَعَةِ وَيَجِبُ الدِّيَةُ فِي مَالِهِ لِمَا قُلْنَا.

وَلِأَبِي حَنِيفَةَ أَنَّ بِالْأَسْرِ صَارَ تَبَعًا لَهُمْ: لِصَيْرُورَتِهِ مَقْهُورًا فِي أَيْدِيهِمْ، وَلِهَذَا يَصِيرُ مُقِيمًا بِإِقَامَتِهِمْ وَمُسَافِرًا بِسَفَرِهِمْ فَيَبْطُلُ بِهِ الْإِحْرَازُ أَصْلًا وَصَارَ كَالْمُسْلِمِ الَّذِي لَمْ يُهَاجِرْ إِلَيْنَا، وَخَصَّ الْخَطَأَ بِالْكَفَّارَةِ: لِأَنَّهُ لَا كَفَّارَةَ فِي الْعَمْدِ عِنْدَنَا.

اس مسئلے میں کتب میں ترجیح نہیں ملتی کہ آیا امام صاحب کا قول راجح ہے یا صاحبین کا؟ تلاشِ بسیار کے باوجود کسی کتاب میں بھی ترجیح معلوم نہیں ہوئی۔ دو وجوہ کی بنیاد صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کی رائے کو ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کے نزدیک مسلمِ حربی چونکہ عصمتِ مقومہ نہیں رکھتا، تو اس کا تعلق اس کی جان ومال دونوں کے ساتھ ہے۔ یعنی جان کی طرح اگر کوئی اس کا مال تلف کرلے تو اس پر بھی کوئی ضمان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام صاحب کے نزدیک جس طرح دار الحرب میں حربی کافر سے سود لیا جاسکتا ہے، اسی طرح مسلمِ حربی سے بھی لیا جاسکتا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ اس کے مال کی عصمت متقوم نہیں ہے، اگرچہ ایسا کرنا دیانتاً مکروہ ہے۔ اس مسئلے میں امام صاحب نے مستامن اور اسیر دونوں کو خارج کیا ہے۔ ان کے نزدیک دار الحرب میں بھی مسلمِ مستامن اور اسیر کی مال میں عصمت متقوم ہے، جس کی وجہ سے ان سے کسی قسم کا سودی معاملہ نہیں ہو سکتا۔ جب مال کی عصمت کے معاملے میں امام صاحب کے نزدیک اسیر مسلمِ حربی کے مثل نہیں ہے، بلکہ اسے عصمتِ متقومہ حاصل ہے تو جان کی عصمت کیسے زائل ہوئی۔ حالانکہ امام صاحب کی تعلیل کے مطابق ایک کا زوال دوسرے کے زوال کو مستوجب ہے۔ یہ امام صاحب کی رائے پر شبہ قائم کرتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ صاحبین کی تعلیل میں یہ نکتہ لائقِ التفات ہے کہ دار کے ساتھ وابستگی [الإحراز بالدار] میں مسلمان کے اختیار واضطرار کو ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے۔ مسلم اسیر اختیاراً دار الاسلام سے وابستہ ہے، مجبوراً دار الحرب میں پھنسا ہے۔ ایسے میں اس کی عصمت کا زوال اس خارجی عنصر کی وجہ سے کر دینا جبکہ احراز بدار الاسلام کی اصل موجود ہے، قوی معلوم نہیں ہوتا۔ اس بات کو امام عثمان زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے 'تبیین الحقائق' میں ان الفاظ میں لکھا ہے:

وَقَالَا يَجِبُ عَلَيْهِ الدِّيَةُ فِي الْعَمْدِ وَالْخَطَأِ فِي مَالِهِ لِأَنَّ الْمَقْتُولَ كَانَ مَعْصُومًا مُتَقَوِّمًا

بِالْإِحْرَازِ بِدَارِ الْإِسْلَامِ فَلَا يَبْطُلُ بِالْأَسْرِ الْعَارِضِ كَمَا لَا يَبْطُلُ بِالدُّخُولِ لِدَارِهِمْ بِأَمَانٍ بَلْ أَوْلَى لِكَوْنِهِ مُضْطَرًّا وَالْمُسْتَأْمَنُ بِاخْتِيَارِهِ۔[81]

امام برہان الدین ابن مازہ رحمۃ اللہ علیہ نے محیط برہانی میں اس مسئلے کی تعلیل یوں بیان کی ہے:

فوجه قولهما: أن المقتول كان معصوما عصمة مقومة بالإحراز بدار الإسلام لو بطلت العصمة إنما تبطل بصيرورته محاربا وتقدير ذلك بصيرورته من أهل دار الحرب، والأسير لم يصر من أهل دار الحرب لأنه ما قصد التوطن ثمة، وصار كما إذا دخل دار الحرب بأمان۔[82]

چنانچہ ان دو وجوہ کی بنیاد پر ہمارا رجحان مسلم اسیر کے معاملے میں صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے ترجیح کی طرف مائل ہے، یعنی دار الحرب میں مسلم اسیر کے قتل پر دیت اور کفارہ لازم آئے گا، واللہ اعلم بالصواب۔

مبحث چہارم: دار الحرب اصلی اور دار الحرب طاری کے بعض احکام میں فرق

اس کے بعد یہ جاننا چاہیے کہ دار الحرب میں دو طرح کے خطے پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ علاقے جہاں کفار کی اکثریت ہے اور وہ کبھی بھی اسلام کے زیرِ سایہ نہیں آئے۔ ایسے علاقوں کو دار الحرب اصلی کہا جاتا ہے۔ دوسرا وہ علاقے جو دار الاسلام تھے بعد میں کفار کے غلبے کے سبب دار الحرب بن گئے، اور ان میں سے بیشتر جگہوں پر مسلمانوں کی بڑی تعداد بستی ہے۔ ایسے علاقوں کو دار الحرب طاری کہا جاتا ہے۔ ہر دو طرح کے علاقے دار الحرب کے حکم میں ہیں۔ فقہائے متقدمین کی کتب میں یہ تقسیم نہیں ملتی ہے، کیونکہ ان کے زمانے میں اس کا وقوع عام طور پر نہیں ہوا۔ اس زمانے میں مسلمان مستقل دار الحرب کے علاقوں کو اسلامی سلطنت کا حصہ بناتے ہوئے دار الاسلام کی حدود کو وسعت دے رہے تھے۔ بعد کے ادوار میں جب مسلمانوں میں ایمان اور جہاد کی ادائیگی میں کمزوری پیدا ہوئی تو کفار مسلمانوں کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے بہت

[81] تبیین الحقائق؛ ج۳، ص۲۶۷

[82] المحیط البرھاني؛ ج۵، ص۱۳۴

سے مسلم علاقوں پر قبضہ کر کے وہاں اپنا اقتدار قائم کر لیا، جس کے سبب مسلمانوں کے وہ علاقے دار الحرب بن گئے۔

جیسے جیسے یہ نوازل [نو آمدہ مسائل] پیش آئے تو فقہائے کرام نے مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے احکامات بیان فرمائے۔ جب دار الاسلام کے علاقے مسلمانوں کے اقتدار سے نکل کر کفار کے قبضے میں چلے گئے اور وقت کے علماء نے ان کے دار الحرب بن جانے کے فتاویٰ دیے تو اس کے ساتھ ہی جہاں ہجرت اور مسلط کفار کے خلاف جہاد کے احکام واضح فرمائے، وہاں دینِ اسلام کے مصالح اور زمینی صورتحال دیکھتے ہوئے دار الحرب طاری میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے بہت سے احکام دار الحرب اصلی سے مختلف بیان فرمائے۔ تاکہ ایک طرف غاصب کفار سے مدافعت اور دوبارہ غلبہ اسلام کی جدوجہد کا آغاز ہو جائے اور دوسری طرف مسلمانوں کے دینی شعائر برقرار اور اجتماعی دینی فضا محفوظ رہے۔

دار الحرب طاری میں ایسے احکام کی کئی مثالیں ہیں جن میں فقہائے متاخرین نے دار الحرب اصلی کے احکام سے اختلاف کیا ہے۔ چند مثالیں ذیل میں درج کی جا رہی ہیں:

دار الحرب میں جمعہ و عیدین کی ادائیگی

مذہبِ حنفی کی کتب میں جمعہ و عیدین کی صحت کی جو شرائط لکھی گئی ہیں، ان میں سے پہلی شرط ایسے شہر کا ہونا ہے جہاں امیر یا قاضی اسلامی احکام نافذ کیے ہو اور دوسری شرط 'مسلمان حاکم' کی موجودگی ہے۔ جب ان شرائط کا فقدان ہو تو کسی جگہ جمعہ و عیدین کی ادائیگی ہی نہ ہو گی۔

متاخرین علماء نے مذکورہ بالا شرائطِ صحت سے صرفِ نظر کر کے دار الحرب میں جمعہ و عیدین کی ادائیگی کے درست ہونے کا فتویٰ دیا۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ در مختار کی عبارت [**وظاهر المذهب أنه كل موضع له أمير وقاض يقدر على إقامة الحدود**] کے تحت لکھتے ہیں:

وفي شرح الشيخ إسماعيل عن الدهلوي: ليس المراد تنفيذ جميع الأحكام بالفعل، إذ الجمعة أقيمت في عهد أظلم الناس وهو الحجاج، وأنه ما كان ينفذ جميع

الأحكام، بل المراد والله أعلم اقتداره على ذلك اهـ ونقل مثله في حاشية أبي السعود عن رسالة العلامة نوح أفندي۔ أقول: ويؤيده أنه لو كان الإخلال بتنفيذ بعض الأحكام مخلا بكون البلد مِصراً على هذا القول الذي هو ظاهر الرواية، لزم أن لا تصح جمعة في بلدة من بلاد الإسلام في هذا الزمان، بل فيما قبله من أزمان، فتعين كون المراد الاقتدار على تنفيذ الأحكام، ولكن ينبغي إرادة أكثرها، وإلا فقد يتعذر على الحاكم الاقتدار على تنفيذ بعضها لمنع ممن ولاه، وكما يقع في أيام الفتنة من تعصب سفهاء البلد بعضهم على بعض، أو على الحاكم بحيث لا يقدر على تنفيذ الأحكام فيهم، لأنه قادر على تنفيذها في غيرهم وفي عسكره، على أن هذا عارض فلا يعتبر، ولذا لو مات الوالي أو لم يحضر لفتنة ولم يوجد أحد ممن له حق إقامة الجمعة نصب العامة لهم خطيبا للضرورة كما سيأتي، مع أنه لا أمير ولا قاضي ثمة أصلا، وبهذا ظهر جهل من يقول لا تصح الجمعة في أيام الفتنة، مع أنها تصح في البلاد التي استولى عليها الكفار كما سنذكره، فتأمل۔[83]

آگے چل کر لکھتے ہیں:

تتمة: في معراج الدراية عن المبسوط: البلاد التي في أيدي الكفار بلاد الإسلام لا بلاد الحرب، لأنهم لم يظهروا فيها حكم الكفر، بل القضاة والولاة مسلمون يطيعونهم عن ضرورة أو بدونها، وكل مصر فيه وال من جهتهم يجوز له إقامة الجمع والأعياد والحد وتقليد القضاة لاستيلاء المسلم عليهم، فلو كان الولاة كفارا يجوز للمسلمين إقامة الجمعة ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين ويجب عليهم أن يلتمسوا واليا مسلما۔[84]

یہاں کوئی یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اس عبارت میں تو تصریح ہے کہ یہ علاقے دار الحرب بنے ہی نہیں، بلکہ دار الاسلام ہیں۔ اس کے جواب میں عرض ہے کہ بنظرِ غائر عبارتِ بالا کو دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ دار

83 رد المحتار؛ ج۳، ص۶

84 رد المحتار، ج۳، ص۱۴

الحرب نہ بننے کی بات اسی صورت میں کر رہے ہیں کہ نہ احکامِ کفر جاری نہ ہوں اور نہ والی و قاضی کفار ہوں، بلکہ مسلمان ہوں۔ جبکہ آخری صورت ایسی بیان نہیں ہوئی؛ اس میں یہ بیان ہے کہ والی وحکام کفار ہوں تو کیا حکم ہو گا۔ ہم اس آخری صورت کو دار الحرب پر ہی محمول کریں گے، اور اسی میں بیان کردہ حکم کو ہم نے مثال میں بیان کیا ہے۔

مسلمانوں کی باہم رضامندی سے قاضیوں کی تقرری

اسی طرح ایک مسئلہ قاضیوں کی تقرری کا ہے۔ قاضی کی تقرری کے لیے لازم ہے کہ مختار حاکم کی طرف سے اس کا تقرر ہو۔ لیکن متاخرین نے اس بات کا فتویٰ دیا کہ جہاں کفار کا غلبہ ہو جائے، مسلمان والی و قاضی نہ رہیں، یعنی وہ علاقہ دار الحرب بن جائے تو ایسے میں مسلمان باہم رضامندی سے کسی شخص کو ازخود قاضی مقرر کر سکتے ہیں۔ علامہ شامی رد المحتار میں لکھتے ہیں:

قوله (ويجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائز) أي الظالم وهذا ظاهر في اختصاص تولية القضاء بالسلطان ونحوه كالخليفة حتى لو اجتمع أهل بلدة على تولية واحد القضاء لم يصح بخلاف ما لو ولوا سلطانا بعد موت سلطانهم كما في البزازية۔ نهر۔ وتمامه فيه۔ قلت وهذا حيث لا ضرورة وإلا فلهم تولية القاضي أيضًا۔

یعنی اس مسئلے میں فتاویٰ بزازیہ میں یہی درج ہے کہ جب تک سلطانِ مسلم کی طرف سے تقرر نہ ہو، سارے شہر کے مسلمان جمع ہو کر اپنی مرضی سے قاضی کا تقرر کر دیں تو یہ تقرری باطل ہو گی۔ لیکن اس کے بعد علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ضرورت کے وقت مسلمانوں کی باہم رضامندی سے قاضی کی تقرری کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور آگے چل کر حوالے میں وہی عبارت لکھی ہے جو اوپر جمعہ و عیدین کے مسئلے میں ہم بیان کر آئے ہیں۔[85]

---

[85] یہ علیحدہ بات ہے کہ قاضی کی تقرری کے معاملے میں بیشتر متاخرین علمائے احناف نے علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اتفاق نہیں کیا ہے۔ اور ہمارے نزدیک بھی راجح قول... بر خلاف علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ... عدمِ صحت اور بطلان کا ہے۔ ہاں، جمعہ و عیدین کے معاملے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہاں بیان سے مقصود حکم میں تغیر کی مثالوں کا بیان ہے۔

کافر حربی سے سود لینے کا مسئلہ

کافر حربی سے سود لینے کی بابت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ دار الحرب میں جواز کے قائل ہیں۔ بر صغیر کے علماء نے جب بر صغیر کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا تو یہاں کافر حربی سے بھی سود لینے کے عدمِ جواز کا فتویٰ دیا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان دار الحرب ہے، مگر دار الحرب کے تمام احکام یہاں جاری نہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو [کفار سے] سود لینا یا دینا بوجہ شبہ جائز نہیں۔ یعنی ہندوستان کے دار الحرب ہونے میں علما کے اختلاف کی وجہ سے شبہ ہو گیا ہے"۔[86]

یہ بات علمائے بر صغیر کے فتاویٰ میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے کہ انھوں نے جہاں ہندوستان کے دار الحرب ہونے کی تصریح کی ہے، وہاں ہندوستان میں کفار سے سود لینے سے منع فرمایا ہے۔

ضروری تنبیہ

ان مثالوں کے بیان کے بعد بطور تنبیہ چند باتیں عرض کی جاتی ہیں:

اول: ان مثالوں کے بیان کرنے سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ جیسے جیسے کفار نے مسلم علاقوں پر قبضے کیے تو علمائے حنفیہ نے بعض احکام میں دار الحربِ اصلی کے احکام سے اختلاف کیا اور اس کی بنیاد شرعی ضروریات کو بنایا گیا۔ لیکن اس کا یہ ہر گز مطلب نہیں ہے کہ اس باب کو چوپٹ کھول کر دار الحرب اصلی کے بیان کردہ احکام کو بدلنا شروع کر دیا جائے، یہاں تک کہ علمائے احناف نے دار الحرب کے جو احکام بیان کیے ہیں، وہ داخلِ کتب ہی رہ جائیں۔

یہاں بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مفتیانِ کرام اس مسئلے کو سمجھیں کہ ضروری نہیں ہے کہ جب اقتدار و حکومتِ کفار کی وجہ سے کسی مسلم علاقے کو دار الحرب قرار دیا جائے تو اب دار الحرب اصلی کے تمام احکام کتبِ فقہ سے دیکھ کر من و عن نافذ کر دیے جائیں، چاہے اس کے سبب مسلمانوں کی اکثریت کے لیے اسلام

[86] کفایت المفتی؛ ج۱، ص۳۸، دار الاشاعت کراچی

کے بہت سے احکام کو معطل کر دیا جائے اور ان کی جان ومال کو غیر محفوظ بنا دیا جائے۔

دوم: اس سے ان حضراتِ علماء کی خدمت میں بھی گزارش ہے کہ جو دارالحرب کا لفظ سنتے ہی 'دار الاباحہ' کی بحث چھیڑ دیتے ہیں اور دار الحرب اصلی کا تصور کرتے ہوئے دنیا میں کسی مسلم علاقے کو چاہے وہاں کفار کا مستحکم ترین قبضہ ہو جائے اور اقتدار میں اسلام کی رمق بھی باقی نہ رہے، تب بھی اسے 'دار الاسلام' قرار دینے پر مصر رہتے ہیں۔ وہ صرف یہی خوف کرتے ہیں کہ دار الحرب قرار دیا تو اسلامی احکام معطل ہو جائیں گے، حالانکہ یہ نہیں دیکھتے کہ دار الاسلام قرار دینے سے اسلامی احکام کے کامل تنفیذ کی امیدیں تک خاک میں مل جائیں گی۔ ایسے علاقوں اور ممالک کو دار الاسلام کہنے کی وجہ سے کفار اور کفری احکام کی شناعت تک مسلمانوں کے دلوں سے نکل جاتی ہے اور کفر کی چھتری تلے زندگی گزارنے کو سندِ جواز فراہم ہو جاتا ہے، جو زیادہ بڑی مصیبت ہے۔ بلکہ اسلام کے حق میں اس سے زیادہ کسی مصیبت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اب کفر کا اقتدار ہی اسلامی قرار دے دیا گیا۔

سوم: یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ دار الحرب کے احکام میں سے اگر کسی قسم کے احکام میں تغیر و تبدیلی کی شرعی ضرورت درپیش ہو یا احکام کی تعلیل اس کی متقاضی ہو تو یہ کوئی آسان معاملہ نہیں ہے اور جس عالم ومفتی کو جو سمجھ میں آئے وہ ویسا کر گزرے، ایسی بات نہیں ہے۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہوئی کہ آج کے دور میں علماء میں سے بعض افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ بعض وہ ہیں جو جزئیاتِ فقہ سے ایسا تمسک رکھتے ہیں کہ فقہ الواقع کی ضروریات بدل بھی جائیں تو وہ جزئیات ہی پر کھڑے رہتے ہیں، جس سے مسلمان حرج میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف ایسا گروہ بھی ہے کہ مقاصدِ شریعت اور اصولوں میں اتنا آزاد ہو گیا ہے کہ جزئیاتِ فقہ کو یکسر مسترد کیے بیٹھا ہے۔ یہ دونوں گروہ عصرِ حاضر کے حالات کے مطابق مسلمانوں کی عملی احکام میں رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں، اور انھی دونوں گروہوں کی خطا سے آج ایک طرف کفر کے اقتدار اور کفری قوانین کی بالادستی مسلمانوں کو قابلِ جواز نظر آ رہی ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کی ذاتی زندگی میں بہت سی محرمات مباحات کا درجہ اختیار کرتی جا رہی ہیں۔

چنانچہ اس کام کے لیے علماء کے پورے طبقے کو متوجہ ہونا چاہیے۔ اور اس کے لیے سب سے پہلے انھیں کفری

طاقتوں اور ان کے ایجنٹوں کے سایے سے بھی دور ہونا چاہیے تاکہ وہ شرعی احکام کی تحقیق و تخریج میں آزادی سے کام کر سکیں۔ اور دوسرا اس کام کو انھی خطوط پر کرنا چاہیے جو پچھلی صدی کے کبار علماء نے متعین کیے ہیں، جیسا کہ محدث علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مقالے 'جدید فقہی مسائل اور چند رہنما اصول' میں بیان کیے ہیں۔[87]

اس حوالے سے صرف ایک بات کی طرف علمائے کرام کی توجہ مبذول کرانا لازمی محسوس ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ چودہ صدیوں میں علمائے امت نے اسلامی احکام پر اس قدر کام کر دیا ہے، کہ آج نوازل میں بھی اسی سے استفادے کو ناگزیر بنایا جائے اور نوازل میں بھی متاخرین نے جو اجتہادات کیے ہیں، انھیں اپنے لیے لازم کیا جائے۔ چھٹی صدی کے بعد سے نوازل سے متعلق تمام مذاہب کے معتبر علمائے کرام کے فتاویٰ کے دفاتر کے دفاتر موجود ہیں، جن میں درج مسائل آج کے مسائل کے حل کے لیے کافی شافی ہیں، ضرورت عرق ریزی سے کام کی ہے۔

مبحث پنجم: موجودہ دنیا کے نقشے پر موجود ممالک میں موجود مسلمانوں کی جان ومال کی عصمت کا بیان

اوپر دار الاسلام اور دار الحرب کے احکام اور وہاں موجود مسلمان کی جان کی عصمت کا حکم اس مقصد سے بیان ہوا ہے کہ آج ہم دنیا کے ممالک میں موجود مسلمانوں کی عصمت کا حکم جان سکیں۔ اس کے لیے یہاں دو احکام بیان ہوں گے۔ پہلا حکم دنیا کے ممالک کی حیثیت کہ کون سے ممالک دار الحرب کے حکم میں ہیں اور کون سے ممالک دار الاسلام کے حکم میں ہیں۔ اور دوسرا وہاں بسنے والے مسلمانوں کی جان ومال کی عصمت کا حکم کیا ہے۔

[87] دیکھیے مقالہ: جدید فقہی مسائل اور چند رہنما اصول [فتاوی بینات؛ ج۱، ص۲۵]

دنیاکے ممالک کی حیثیت

اس وقت دنیا میں ممالک کی جو حد بندی موجود ہے، اس میں جہاں کفار کی اکثریت ہے، وہ عرفِ عام میں کفری ممالک ہیں اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہ عرفِ عام مسلم ممالک کہلاتے ہیں۔ دار الاسلام اور دار الحرب کی جو تعریفات فقہاء نے بیان کی ہیں، ان میں سے کسی میں بھی آبادی کی اکثریت واقلیت کو دار پر حکم کا مدار نہیں بنایا گیا ہے، بلکہ اسلام اور کفر کے غلبے کو مدار بنایا گیا ہے اور اس کی بنیادی علامت اجرائے احکام کو قرار دیا گیا ہے۔ علامہ رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس معاملے میں فقہاء کی عبارتیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اس عبارت کے نقل کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ کسی ملک کے دار الاسلام یا دار الحرب ہونے کا مدار صرف اسلام یا کفر کے غلبے پر ہے۔... محض اس بناپر کہ اس ملک میں مسلمان آباد ہیں یا کفار کی اجازت سے شعائرِ اسلامیہ کو ادا کرسکتے ہیں، اس ملک کو دار الاسلام نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ کسی ملک میں محض مسلمانوں کے آباد ہونے اور باذنِ کفار شعائرِ اسلامیہ ادا کرسکنے کا کوئی اعتبار نہیں"۔[88]

محدث علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے کو مزید وضاحت سے بیان فرمایا۔ لکھتے ہیں:

"دار الاسلام کا اصلی مدار 'فصلِ خصومات' پر ہے کہ پورا قانونِ تعزیرات وحدود، محاکم شرعیہ عدلیہ قائم ہوں اور معاملات وعقوبات کا قانون مکمل اسلامی ہو، تعزیرات وحدود قانونِ اسلامی کے مطابق جاری ہوں"۔[89]

لہٰذا معلوم ہوا کہ ممالک میں آبادی کا تناسب دار کے تعین میں کوئی کردار نہیں رکھتا، بلکہ اگر وہاں کا نظامِ حکومت کفری ہے اور وہاں کفری قوانین نافذ ہیں، تو وہ ملک دار الحرب ہے۔ اور اگر وہاں کی حکومت اسلامی ہے اور اسلامی احکام نافذ ہیں، تو وہ دار الاسلام کے حکم میں ہے۔

اس کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کفری اکثریت والے ممالک... جن میں سے بیشتر... ہمیشہ سے دار الحرب ہیں،

---

[88] تالیفاتِ رشیدیہ؛ ص ۶۵۷،۵۶۵

[89] فتاویٰ بینات؛ ج ا، ص ۲۹

ایک دن کے لیے بھی دار الاسلام نہیں بنے۔ ان کا حکم تو واضح ہے۔ باقی وہ مسلم ممالک جو اسلامی سلطنت کے ہوتے ہوئے دار الاسلام کے حکم میں تھے کیونکہ وہاں مسلمان غالب اور اسلام نافذ تھا۔ لیکن انیسویں صدی میں عالمی کفری طاقتوں کے حملوں اور پھر خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد کفار کے زیرِ تسلط چلے گئے تھے اور وہاں کفار نے اسلامی قوانین ختم کر کے کفری قوانین نافذ و جاری کر دیے تھے۔ اور بعد میں ایسے بہت سے ممالک کو بظاہر آزادی ملی، لیکن وہاں کے حکمرانوں نے ایک دن کے لیے دوبارہ اسلامی احکام نافذ نہیں کیے، بلکہ کفری احکام، دستور و قوانین نافذ کیے ہیں اور اپنی قوت سے نافذ رکھنا چاہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان ممالک میں بھی غلبہ کفر کو حاصل ہے کیونکہ حکم کفر کا چلتا ہے، چاہے چلانے والوں کے نام مسلمانوں جیسے ہیں۔ فقہاء کی تعریفات کے مطابق یہ ممالک 'دار الحرب' کے حکم میں ہیں اور یہاں کی حکومتیں اسلام دشمن اور محارب ہیں جن کے خلاف جہاد فرض ہے تاکہ اقتدار ان سے چھین کر صالح قیادت کے ہاتھ میں دیا جائے جو ان ملکوں میں اسلام کی بالادستی قائم کرے اور اسلامی احکام [شریعت] نافذ کرے۔

یہ حکم اس صدی میں مجاہدین کے کئی علماء بیان کر چکے ہیں۔ فلسطین سے تعلق رکھنے والے شیخ عبد اللہ عزام شہید رحمۃ اللہ علیہ، مصر سے تعلق رکھنے والے شیخ رفاعی طہ شہید رحمۃ اللہ علیہ [شیخ عمر عبد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کے رفیق] اور ہمارے استاد شیخ ابو یحیی شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔[90]

اس وقت صرف وہ علاقے دار الاسلام کہلائیں گے، جہاں مسلمانوں نے اپنی قوت سے کل یا بعض اسلامی احکام نافذ کر رکھے ہیں اور جہاں کفر کے احکام بالکلیہ مفقود ہیں، جیسے امیر المومنین شیخ ہبۃ اللہ حفظہ اللہ کی قیادت میں امارتِ اسلامیہ افغانستان کے ماتحت افغانستان اور حرکۃ الشباب المجاہدین کے ماتحت صومالیہ وغیرہ۔

---

[90] شیخ فارس آل شویل الزهراني [أبو جندل الأزدي] شہید رحمۃ اللہ علیہ... جنھیں سال ۱۴۳۸ھ میں آل سعود نے پھانسی دے کر شہید کر دیا... انھوں نے اپنے مقالہ 'العلاقات الدولية في الإسلام' میں شیخ عبد اللہ عزام رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت ان کی کتاب 'الهجرة والإعداد' سے ذکر کی ہے اور شیخ رفاعی طہ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت ان کی کتاب 'إماطة اللثام عن بعض أحكام ذروة سنام الإسلام' سے ذکر کی ہے۔ شیخ ابو یحیی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب 'منة الخبير' میں یہ رائے ذکر کی ہے۔

کفری قوانین کے حامل مسلم آبادی والے ممالک میں بسنے والے عامۃ المسلمین کی جان ومال کی عصمت کا حکم

جب یہ طے ہوا کہ اس وقت وہ مسلم آبادی والے ممالک [چاہے وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو یا چاہے بحیثیتِ مجموعی اکثریت نہ ہو لیکن وہ علاقے پہلے دارالاسلام رہے ہوں، جیسے بھارت وچین] جو زمانے سے دار الاسلام چلے آتے تھے اور وہاں رہنے والے مسلمانوں کے آباء واجداد اسی دار الاسلام میں اسلامی احکام کے تحت زندگیاں گزارتے تھے، بعد میں کفار کے غلبے کی وجہ سے دار الحرب بن گئے اور ابھی تک بدستور دار الحرب ہیں... جیسا کہ برصغیر کے ممالک... تو یہاں کے عامۃ المسلمین کی جان ومال کی عصمت کا کیا حکم ہو گا اور ان کی جان ومال کے تلف پر کیا احکام مرتب ہوں گے۔

اس حوالے سے کتبِ متاخرین میں صراحت سے کوئی کلام نہیں ملتا ہے۔ متقدمین کے یہاں دار الحرب میں جن مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے، وہ تین ہی قسم کے ہیں:

اول: مسلمِ حربی۔ وہ مسلمان جو دار الحرب کا کافر تھا، وہیں مسلمان ہوا اور دار الاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی۔

دوم: مسلمِ مستامن۔ وہ مسلمان جو دارالاسلام کا رہائشی ہے، وقتی طور پر کفار سے امان لے کر دار الحرب میں داخل ہوا۔

سوم: مسلمِ اسیر۔ وہ مسلمان جو دار الاسلام کا رہائشی ہے، جسے کفار قیدی بنا کر دار الحرب لے گئے۔

اس کے علاوہ چوتھے کسی قسم کے مسلمان کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ مسلم اکثریتی ممالک کے مسلمانوں کی حیثیت ان تینوں قسموں سے مختلف ہے۔ اگر ان پر قیاس کرنا چاہیں تو یہ آسان نہیں، کیونکہ ہر ایک سے مغایرت پائی جاتی ہے۔ تاہم اس قدر ضرور ہے کہ اس مسلمان کی حیثیت مسلمِ حربی کی تو بالکل نہیں ہے، کیونکہ اس کے پاس احراز بدار الاسلام کی اصل موجود ہے، یعنی اس کا اپنا وطن پہلے دار الاسلام تھا، اب دار الحرب بنا ہے، برخلاف مسلمِ حربی کے۔ جب مسلمِ حربی کا امکان خارج کر دیں تو پھر عصمت مقوّمہ کی نفی معدوم ہوئی۔ اور جب دار الاسلام سے وابستگی کا شبہ موجود ہے ...جو وقتی طور پر بلاشبہ معدوم ہے... تو اسے مسلمِ مستامن یا مسلمِ اسیر ہی پر

قیاس کریں گے۔ اور ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ ان دونوں کو عصمت وہی حاصل ہے جو دار الاسلام کے مسلمان کو حاصل ہوتی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ مسلم آبادی والے ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کو عصمتِ مؤثمہ کے ساتھ عصمتِ مقوّمہ بھی حاصل ہے اور ان کی جان ومال کو نقصان پہنچانا قابلِ سزا جرم ہے۔

اس رائے کی تقویت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بعض علماء کے نزدیک یہ ممالک اب بھی دار الاسلام کے حکم میں ہیں۔ اگرچہ یہ رائے انتہائی ضعیف ہے، تاہم اس سے شبہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔ ایسے میں ان ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کو مسلمِ حربی پر قیاس کر کے ان کی عصمت کو ناقص سمجھنے کی گنجائش قطعاً نہیں۔

مسلم آبادی والے ممالک میں قتلِ مسلم کے احکام

جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان مسلمانوں کی عصمت متقوم ہے۔ تو اب باقی احکام ملاحظہ کیجیے:

ا۔ قتلِ عمد کی صورت میں جس طرح مسلمِ مستامن کی بابت دار الحرب میں قصاص ساقط ہو جاتا ہے، اسی طرح یہاں بھی قتلِ عمد کی صورت میں قصاص ساقط ہو گا۔ قصاص کے سقوط کا بنیادی سبب یہ ہے کہ قصاص کی ادائیگی کے لیے حاکمِ مسلم کی قوت درکار ہوتی ہے جو ان ممالک میں مفقود ہے۔ کوئی ولی مقتول اپنے بل بوتے پر قاتل کو زبردستی پکڑ کر اس سے قصاص نہیں لے سکتا ہے، جب تک کہ حاکمِ مسلم کی طرف سے مدد نہ ملے۔ ان ممالک میں کفر کی حاکمیت کی وجہ سے بلاشک یہ قوت حاصل نہیں ہے۔ اسی سبب سے یہ دار الحرب کے حکم میں ہیں۔

شرح السیر الکبیر میں لکھا ہے:

قَالَ: وَلَوْ كَانَا مُسْلِمَيْنِ فِي دَارِ الْحَرْبِ بِأَمَانٍ فَعَامَلَ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ، فَهَذَا وَمَا لَوْ كَانَتْ الْمُعَامَلَةُ بَيْنَهُمَا فِي دَارِ الْإِسْلَامِ عَلَى السَّوَاءِ؛ لِأَنَّ الْمُسْلِمَ مُلْتَزِمٌ بِحُكْمِ الْإِسْلَامِ حَيْثُمَا يَكُونُ، وَمَالُ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مَالٌ مَعْصُومٌ مُتَقَوِّمٌ فِي حَقِّ صَاحِبِهِ، لِبَقَاءِ الْإِحْرَازِ فِيهِ حُكْمًا، وَإِنْ كَانَ دَخَلَ إلَيْهِمْ بِأَمَانٍ، فَلِهَذَا كَانَ حَالُهُمَا فِي دَارِ الْحَرْبِ كَحَالِهِمَا فِي دَارِ الْإِسْلَامِ، فِي كُلِّ مُعَامَلَةٍ تَجْرِي بَيْنَهُمَا، إلَّا فِي خِصَالٍ ثَلَاثٍ؛ إنْ قَتَلَ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ عَمْدًا لَمْ يَجِبْ عَلَى الْقَاتِلِ قِصَاصٌ، لِقِيَامِ الشُّبْهَةِ بِكَوْنِهِمَا فِي دَارِ

الْإِبَاحَةِ، وَلِأَنَّهُ لا يَتَمَكَّنُ مِنْ اسْتِيفَاءِ الْقِصَاصِ بِقُوَّةِ نَفْسِهِ عَادَةً، وَالْقَاتِلُ لَيْسَ فِي يَدِ الْإِمَامِ لِيُعِينَهُ عَلَى اسْتِيفَاءِ الْقِصَاصِ، فَلَا يَجِبُ الْقِصَاصُ وَلَكِنْ تَجِبُ الدِّيَةُ فِي مَالِه۔[91]

پس قتلِ عمد کی صورت میں قاتل کے مال میں سے دیت لازم آئے گی۔

۲۔ قتلِ شبہ عمد، خطا و دیگر میں دیت اور کفارہ دونوں لازم آئیں گے۔ البتہ مسلمِ مستامن کے معاملے میں دیت اسی کے مال میں سے لازم آتی ہے، کیونکہ اس کی عاقلہ دار الاسلام میں موجود ہے، جبکہ وہ خود دار الحرب میں ہوتا ہے اور تباینِ دار کی وجہ سے عاقلہ کی نصرت منقطع ہوتی ہے۔ اس علت کی وجہ سے دیت قاتل کے مال میں لازم آتی ہے۔ جیسا کہ شرح السیر الکبیر میں لکھا ہے:

وَكَذَلِكَ إنْ قَتَلَهُ خَطَأً لِأَنَّ التَّعَاقُلَ بِاعْتِبَارِ التَّنَاصُرِ، وَلَا تَنَاصُرَ بَيْنَ مَنْ فِي دَارِ الْحَرْبِ وَبَيْنَ مَنْ فِي دَارِ الْإِسْلَامِ، فَلِهَذَا لَا يَكُونُ عَلَى عَاقِلَتِهِ مِنْ الدِّيَةِ شَيْءٌ۔[92]

ہمارے مسئلے میں معاملہ ایسا نہیں ہے۔ چونکہ ان ممالک میں مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں ہے، ان کی برادریاں، قبیلے، جماعتیں اور تنظیمات سب کچھ یہاں موجود ہیں اور تناصر کی صورت موجود ہے۔ اس لیے یہاں قتلِ خطا کی دیت میں دار الاسلام والا حکم جاری ہوگا، یعنی دیت قاتل کی عاقلہ پر لازم آئے گی اور کفارہ قاتل پر ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ کفری نظام اور قوانین کے حامل مسلم اکثریتی ممالک میں موجود مسلمان کے قتلِ عمد کی صورت میں قاتل پر قصاص نہ ہوگا، باقی تمام قسم کے قتل کے احکام وہی ہوں گے جو دار الاسلام میں مسلمان کے قتل کے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

مغربی ممالک میں موجود مسلمانوں کی عصمت کا حکم

مغرب اور غیر مغرب کے وہ ممالک جو کبھی بھی دار الاسلام نہیں رہے ہیں، ہمیشہ سے دار الحرب ہیں، وہاں

---

[91] شرح السیر الکبیر؛ ج۵، ص۱۲۹

[92] شرح السیر الکبیر؛ ج۵، ص۱۳۰

موجود مسلمانوں میں کئی قسم کے مسلمان موجود ہیں، جنھیں ہم واقعاتی صورتحال کے لحاظ سے تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ وہاں کے کفار جو مسلمان ہوئے اور وہیں رہائش پذیر ہیں۔

۲۔ مسلم ممالک کے مسلمان جو ان ممالک میں شہریت حاصل کر کے وہیں رہائش پذیر ہو گئے ہیں۔

۳۔ مسلم ممالک کے مسلمان جو ان ممالک میں وقتی قیام کے ارادے سے موجود ہیں۔

ان میں سے پہلی قسم کا حکم مسلمِ حربی کا ہے، جو اوپر تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ آخری قسم کا حکم مسلم ممالک کے مسلمانوں والا ہے۔ دوسری قسم کا حکم بھی پہلی قسم کی طرح مسلمِ حربی والا ہے کیونکہ ان لوگوں نے اختیاراً دار الحرب میں سکونت اختیار کر کے جو دار الاسلام سے وابستگی کا شبہ تھا، وہ بھی زائل کر دیا ہے۔ محیط برہانی میں دار الحرب میں قصاص کے انتفاء کی تعلیل بیان کرتے ہوئے یہ نکتہ لکھا ہے:

أن دخوله دار الحرب لو كان للسكنى لبطلت العصمة أصلا۔[93]

ان تمام سے متعلق احکام اوپر بیان ہو چکے ہیں۔

مبحثِ ششم: مسلم ممالک میں قتل کے معاملات کے تصفیہ کا طریقہ

آخری بات اس ضمن میں یہ رہ جاتی ہے کہ وہ مسلم اکثریتی ممالک جو دار الحرب کے حکم میں ہیں، وہاں قتل کے معاملات کا تصفیہ کیسے ہو گا؟ اس حوالے سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان تمام ممالک میں شریعت کے مطابق قضا کا کوئی نظام موجود نہیں ہے۔ ان عالمی نظام کے تحت چلنے والے اور جمہوریت کے حامل ان ممالک میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جہاں شرعی قاضی کا وجود ہو۔ اسے موجودہ زمانے کی سب سے بڑی بدقسمتی کہیے کہ اس وقت مسلمانوں کی اکثریت کو اپنے باہمی تنازعات کے لیے اسلام کے احکامات پر عمل پیرا ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس وقت دنیا میں عالمِ کفر نے جس عالمی نظام کو غالب کر رکھا ہے، اس کے تحت انسانوں کی اجتماعیت کے

---

[93] المحیط البرھاني؛ ج۵، ص ۱۳۳

تمام قوانین انسانوں کے بنائے ہوئے نافذ ہوتے ہیں۔ یہ نظام انسانوں سے ماوراء کسی اللہ تعالیٰ کے احکامات کو اجتماعیت میں قانون کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہی تو کفر اور اسلام کی جنگ ہے، اور یہی تو مسلم ملکوں میں کفر کے غلبے کی علامت ہے۔

چنانچہ شرعی قضا کا نظام نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے بیشتر معاملات غیرِ شریعت کے مطابق چل رہے ہیں۔ شریعت کے مطابق فیصلہ لینے کی کوئی سبیل موجود نہیں ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اسلام کا بہت بڑا حصہ آج [نعوذ باللہ] بے سود ہو گیا ہے۔ یہ بات خود مسلمانوں کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہونی چاہیے کہ آج کفار کی سازشوں کی بدولت اسلام ہی ان کے لیے ادھورا کر دیا گیا ہے۔ اور یہی بات مسلمانوں کو ان کا فرض بھی یاد دلاتی ہے کہ دنیا میں اسلام کے غلبے کی کوشش کرنا ان پر فرض ہے اور اس کوشش میں سب سے بنیادی فرض جہاد فی سبیل اللہ کے لیے کمربستہ ہونا ہے۔ یہی جہاد کا راستہ ہے جس کے ذریعے کفر کی شوکت ٹوٹتی ہے اور جب کفر کی شوکت ٹوٹے گی تو اسلام کے غلبے اور اسلامی احکام کے احیاء کی صورت پیدا ہو گی۔ یہی موجودہ صورتحال ان ملکوں میں بھی جہاد کی فرضیت کی دلیل ہے، یہاں تک کہ ان ملکوں میں بھی شریعت نافذ ہو۔

مسلم ممالک کی ملکی [غیر شرعی] عدالتوں سے فیصلہ کرانا حرام ہے

سو ان ملکوں میں جہاں شریعت کے مطابق قضا کا نظام موجود نہیں ہے، بلکہ ملکی عدالتیں انسانی ساختہ قوانین کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرتی ہیں اور وہاں قتل کے مقدمات میں سزائیں بھی اسلام کے خلاف ہیں، تو ایسی عدالتوں سے قتل کے مقدمات کا فیصلہ کرنا بذاتِ خود ناجائز اور حرام ہے۔ اور اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے کہ یہ قوانین اسلام مخالف ہیں، 'برضا و رغبت' کفری قوانین کے مطابق اپنے مقدمات فیصل کرانے جائے گا تو ایسا شخص کافر ہو جائے گا، والعیاذ باللہ۔ قرآنِ مجید نے یہ صفت منافقین کی بیان فرمائی ہے کہ وہ اپنے مقدمات کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بجائے انسانوں کے بنائے قوانین کے مطابق کروانے کو پسند کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ

الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا (60) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا (61)﴾ [النساء]

اس آیت میں 'طاغوت' سے مراد ہر وہ غیر اللہ ہے، جس کی اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اطاعت کی جائے اور اس کا حکم مانا جائے۔ ان ملکوں میں موجود عدالتیں طاغوتی عدالتیں ہیں اور ان کے قوانین انسانوں کے بنائے ہوئے طاغوتی قوانین ہیں۔ لہٰذا ان سے فیصلہ کرانا کسی طور جائز نہیں ہے، حرام ہے۔ اور جو کوئی جانتے بوجھتے اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف ان قوانین سے راضی ہو تو خدشہ ہے کہ کہیں یہ اپنے اس فعل کی وجہ سے کافر ہو جائے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ نساء کی ان آیات کے سیاق میں اپنے تفسیری حاشیہ میں لکھا ہے:

" جس کو اللہ اور قیامت پر ایمان ہو گا، وہ ضرور اختلاف کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف رجوع کرے گا اور ان کے حکم کی مخالفت سے بے حد ڈرے گا۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ جو اللہ اور رسول کے حکم سے بھاگے گا، وہ مسلمان نہیں۔ اس لیے اگر دو مسلمان آپس میں جھگڑا کریں، ایک نے کہا: چلو شرع کی طرف رجوع کریں، دوسرے نے کہا: میں شرع کو نہیں سمجھتا یا مجھ کو شرع سے کام نہیں، تو اس کو بیشک کافر کہیں گے"۔[94]

قتل کے معاملہ میں صرف ایک صورت میں ان عدالتوں کی طرف رجوع کی گنجائش موجود ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب اولیائے مقتول کو قوی امید ہو کہ عدالت کی وجہ سے قاتل کے ساتھ صلح کی کوئی صورت بن جائے گی۔ یعنی عدالت اور نظام کی قوت کا استعمال کرتے ہوئے قاتل کو صلح پر مجبور کرنے کے لیے عدالت میں جانا جائز ہے، باقی صلح انھی احکام کے مطابق کی جائے جو شریعت نے متعین کیے ہیں اور جنھیں ہم پچھلی فصل میں بیان کر آئے ہیں۔

تحکیم اور صلح کے طریقے سے قتل کے تنازعات کا تصفیہ

شرعی قضا نہ ہونے کے سبب قتل کے تنازعات میں ان ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے سامنے دو ہی

94 تفسیرِ عثمانی؛ ج ۱، ص ۴۱۵

طریقے ہیں۔ ایک تحکیم کا طریقہ اور دوسرا صلح کا طریقہ۔ ان دونوں طریقوں کی تفصیل ہم پچھلی فصل میں بیان کر آئے ہیں۔

تحکیم کے لیے ضروری ہے کہ ان ممالک کے مسلمان معتبر علمائے کرام کی طرف رجوع کریں، جن کا علم اور تقویٰ مسلّم ہو۔ اور انھیں ان تنازعات میں حَکَم بنائیں۔ اس حوالے سے بالخصوص مدارس میں موجود دار الافتاء کے مفتیانِ کرام کی خدمت میں حاضر ہوا جائے اور ان کے ذریعے قتل کے تنازعات کا فیصلہ کیا جائے۔

فصل پنجم: تترس کے احکام

آج کے جہاد میں بالعموم سب سے زیادہ توجہ کا مرکز 'تترس' کامسئلہ رہا ہے۔ کیونکہ آج، جہاد کے عملی تجارب میں اس مسئلے کے اطلاق اور تطبیق کی ضرورت بارہا پیش آتی ہے۔ یہ مسئلہ جہاد کے عملی مسائل میں ابتدائے اسلام سے چلا آرہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس مسئلے کے حوالے سے خود ائمہ مجتہدین کے واضح اقوال مل جاتے ہیں۔ پھر بعد کے علماء بھی اسے مستقل کتبِ فقہ میں جگہ دیتے رہے ہیں۔ یہ ان کی محنتوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہمیں اس مسئلے کی از سرِ نو استنباط اور تعلیل کی ضرورت پیش نہیں آئی، بلکہ ذخیرہ فقہ میں سے احکام کا وافر حصہ مل گیا۔

اس کے باوجود جب ہم علمائے متقدمین کے بیان کردہ مسئلہ تترس کو پڑھتے ہیں تو وہ اپنے حالات کے موافق جنگی چالوں کو مخاطب ہیں، جن کی ہمارے دور میں صورتیں مختلف ہو چکی ہیں۔ اس لیے اپنے فقہ الواقع کے تمام پہلوؤں کو دیکھ کر علمائے متقدمین کے بیان کردہ مسئلہ سے حدود و قیود اخذ کرنے اور اس مسئلے کی کھلی بے لگام تطبیق کو روک کر مصالح ومفاسد کے موازنہ سے لبریز کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس ضرورت کا ذکر خود محسنِ امت شیخ اسامہ بن لادن شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک خط میں شیخ عطیۃ اللہ اللیبی شہید رحمۃ اللہ علیہ سے ان لفظوں میں کیا:

وأحسب أن مسئلة التترس قد بحثت منذ قرون في ظروف مختلفة عن الواقع اليوم فهي بحاجة إلى إعادة بحث حسب المعطيات المعاصرة ووضع حدود واضحة يفقها عامة الإخوة حتى لا يقع ضحايا من المسلمين إلا في ضرورة قصوى۔[95]

اسی مسئلے کے حوالے سے ہمارے استاد شیخ ابو یحییٰ اللیبی شہید رحمۃ اللہ علیہ نے 'مسئلۃ التترس في الجهاد المعاصر' کے

---

[95] SOCOM-2012-0000019، ص۴

عنوان سے کتاب تحریر فرمائی۔[96] اسی طرح محترم شیخ ایمن الظواہری حفظہ اللہ نے بھی اس مسئلے پر اپنی کتاب 'التبرئۃ' میں کلام کیا ہے۔[97] ہم نے اس فصل میں ان دونوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

مبحث اول: مسئلہ تترس کی وضاحت اور فقہائے امت کے اقوال

تترس کا لفظ تَتَرَّسَ يَتَتَرَّسُ سے مصدر ہے۔ اور یہ عربی کے لفظ 'تُرْس' سے مشتق ہے۔ لغتِ عربی میں 'ترس' 'ڈھال' کو کہتے ہیں جس کے ذریعے جنگ میں لڑنے والا اپنے مقابل دشمن کے وار کو روکتا ہے، خواہ وہ وار تیر سے ہو، تلوار یا نیزے سے ہو۔ ایک حدیث میں غزوۂ احد کے واقعات میں یہ الفاظ مروی ہیں:

كان أبو طلحةَ يَتَتَرَّسُ معَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم بتُرْسٍ واحد۔[98]

"سیدنا ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ ایک ہی ڈھال سے اپنے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی دفاع کر رہے تھے"۔

پہلے زمانے میں کفار مسلمان قیدیوں، بچوں یا ذمیّوں کو مسلمانوں کے مدِ مقابل اپنی ڈھال کے طور پر استعمال کرتے تھے، اس انداز میں کہ کفار جنگ میں اپنی صفوں سے بھی قبل انھیں رکھتے تھے، تاکہ مدِ مقابل مسلمان لشکر ڈھال بنائے گئے مسلمانوں کو نقصان پہنچائے بغیر کفار تک نہ پہنچ سکے یا جنگ سے ہی باز آ جائے۔ یہ اس زمانے کی جنگی چال تھی۔ آج بھی یہ چال استعمال ہوتی ہے، لیکن آج چونکہ جنگوں کی نوعیت مختلف ہو گئی ہے اور روایتی جنگ کی جگہ غیر روایتی جنگ نے لے لی ہے، اس چال کی عملی شکلیں مختلف ہو گئی ہیں۔

تترس کی دو صورتیں

اس مسئلے کے حوالے سے فقہاء کی کتب میں دو صورتیں ملتی ہیں۔

پہلی صورت: جب مسلمان کفارِ حربی کے کسی قلعے پر حملہ آور ہوں تو اب یہ ممکن ہے کہ اس قلعے میں جیسے کفارِ

---

[96] ہمارے انتہائی عزیز بھائی اور دوست مولانا عبد المجید نعمانی حفظہ اللہ نے اس کتاب کو اردو قالب میں ڈھالا تھا، تاہم وزیرستان آپریشن کے سبب مسودہ کہیں کھو گیا۔ قدر اللہ وماشاء فعل!

[97] دیکھیے: التبرئۃ؛ الباب الثاني: مناقشۃ موضوعات الوثیقۃ، الفصل الثامن: حکم رمي الکفار إذا اختلط بھم مسلمون أو من لا یجوز قتلہ

[98] صحیح البخاري؛ ص۱۶۷ [کتاب الجھاد والسیر؛ باب المِجن ومن یترّس بترس صاحبہ]

حربی کی عورتیں بچے ہوں گے، اسی طرح کچھ مسلمان [تاجر یا قیدی] بھی ہو سکتے ہیں۔ ان مسلمانوں کے ہوتے ہوئے اس قلعے پر حملہ کرنا مسلمانوں کے لیے جائز ہے، چاہے اس میں موجود بعض مسلمان بھی قتل ہو جائیں۔ یہ صورت اختیاری صورت ہے۔

دوسری صورت: جب کفارِ حربی اپنے ساتھ مسلمان قیدیوں یا بچوں کو پکڑ کر اپنے سامنے ڈھال بنالیں، تو ایسے میں مسلمان لشکر کے لیے جائز ہے کہ وہ ان کفار پر حملہ کرے، چاہے ڈھال بنائے ہوئے مسلمان بھی مارے جائیں۔ یہ اضطراری صورت ہے۔

تنبیہ: مسئلہ ھذہ کی اصل کو سمجھیے

ایک بات تو یہ جاننی چاہیے کہ اس پورے مسئلے کے لیے لفظِ تترس کا استعمال موجودہ دور میں علی الاطلاق ہونے لگا ہے۔ وگرنہ فقہاء نے مذکورہ بالا دوسری صورت کے لیے ہی 'تترس' کا لفظ استعمال کیا ہے، پہلی صورت کے لیے نہیں۔

دوسری بات یہ سمجھنے کی ہے کہ جن فقہاء [بشمولِ احناف] نے تترس کی مذکورہ صورت کے جواز کی بات کی ہے، اس کا جواز ان کے نزدیک پہلی صورت کے جواز پر قیاس سے ثابت ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کی اصل مذکورہ بالا دو صورتوں میں سے پہلی صورت ہے۔ پہلی صورت کا حکم دوسری صورت پر منطبق ہوتا ہے۔ امام ابو بکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ 'احکام القرآن' میں فرماتے ہیں:

وَإِذَا ثَبَتَ مَا ذَكَرْنَا مِنْ جَوَازِ الْإِقْدَامِ عَلَى الْكُفَّارِ مَعَ الْعِلْمِ بِكَوْنِ الْمُسْلِمِينَ بَيْنَ أَظْهُرِهِمْ، وَجَبَ جَوَازُ مِثْلِهِ إِذَا تَتَرَّسُوا بِالْمُسْلِمِينَ؛ لِأَنَّ الْقَصْدَ فِي الْحَالَيْنِ رَمْيُ الْمُشْرِكِينَ دُونَهُمْ۔[99]

اس مسئلے کی اصل جاننا اس لیے ضروری ہے کہ مسئلہ تترس کا حکم اسی اصل کے حکم پر کھڑا ہے۔ اب اس اصل کے حکم کی جو تفصیل فقہاء نے بیان کی ہے، وہی فرع پر بھی منطبق ہو گی اور اسی کی روشنی میں ہمیں موجودہ دور

---

[99] أحکام القرآن؛ ج۵، ص۲۷۵

میں مسئلے کی تطبیق میں مدد ملے گی۔

فقہاء کے اقوال

اس مسئلے کے بیانِ جواز میں احناف نے زیادہ کلام کیا ہے، یہاں تک کہ ان کے بیانِ جواز سے مطلق جواز کا شبہ ہوتا ہے۔ حالانکہ فقہائے احناف کی تعلیل دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ وہ اس مسئلے میں کئی قیود کا ذکر کرتے ہیں۔ ہم یہاں اصالۃً احناف کا مسلک بیان کریں گے، تبعاً دوسرے مذاہب کے اقوال ذکر کریں گے۔

امام ابو بکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے 'احکام القرآن' میں اس مسئلے پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

قال أبو حنيفة وأبو يوسف وزفر ومحمد والثوري: "لا بأس برمي حصون المشركين، وإن كان فيها أسارى وأطفال من المسلمين، ولا بأس بأن يحرقوا الحصون ويقصدوا به المشركين، وكذلك إن تترس الكفار بأطفال المسلمين رمي المشركون، وإن أصابوا أحدا من المسلمين في ذلك فلا دية ولا كفارة۔...

نقل أهل السير أن النبي صلى الله عليه وسلم حاصر أهل الطائف ورماهم بالمنجنيق مع نهيه صلى الله عليه وسلم عن قتل النساء والولدان، وقد علم صلى الله عليه وسلم أنه قد يصيبهم وهو لا يجوز تعمدهم بالقتل، فدل على أن كون المسلمين فيما بين أهل الحرب لا يمنع رميهم; إذ كان القصد فيه المشركين دونهم. وروى الزهري عن عبيد الله بن عبد الله عن ابن عباس عن الصعب بن جثامة قال: سئل النبي صلى الله عليه وسلم عن أهل الديار من المشركين يبيتون فيصاب من ذراريهم ونسائهم، فقال "هم منهم" . وبعث النبي صلى الله عليه وسلم أسامة بن زيد فقال: "أغر على أبنى صباحا وحرق" ، وكان يأمر السرايا بأن ينتظروا بمن يغزو بهم، فإن أذنوا للصلاة أمسكوا عنهم، وإن لم يسمعوا أذانا أغاروا" وعلى ذلك مضى الخلفاء الراشدون. ومعلوم أن من أغار على هؤلاء لا يخلو من أن يصيب من ذراريهم ونسائهم المحظور قتلهم، فكذلك إذا كان فيهم مسلمون وجب أن لا يمنع ذلك من شن الغارة عليهم ورميهم بالنشاب وغيره، وإن خيف عليه إصابة المسلم. فإن قيل: إنما جاء ذلك; لأن ذراري المشركين منهم، كما قال النبي صلى الله عليه وسلم في حديث الصعب بن جثامة قيل له: لا يجوز أن يكون مراده صلى الله عليه

وسلم في ذراريهم أنهم منهم في الكفر; لأن الصغار لا يجوز أن يكونوا كفارا في الحقيقة ولا يستحقون القتل ولا العقوبة لفعل آبائهم في باب سقوط الدية والكفارة....

وإذا ثبت ما ذكرنا من جواز الإقدام على الكفار مع العلم بكون المسلمين بين أظهرهم وجب جواز مثله إذا تترسوا بالمسلمين; لأن القصد في الحالين رمي المشركين دونهم ومن أصيب منهم فلا دية فيه ولا كفارة، كما أن من أصيب برمي حصون الكفار من المسلمين الذين في الحصن لم تكن فيه دية ولا كفارة ولأنه قد أبيح لنا الرمي مع العلم بكون المسلمين في تلك الجهة، فصاروا في الحكم بمنزلة من أبيح قتله فلا يجب به شيء۔[100]

امام ابو بکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں احناف سے کفار کے قلعوں پر منجنیق سے حملہ کرنے کا جواز بیان کیا ہے، چاہے اس حملے میں قلعے میں موجود بعض مسلمان بھی مارے جائیں، اور اسی کی بنیاد پر اس بات کا جواز ذکر کیا ہے کہ اگر کفار بعض مسلمانوں کو اپنے سامنے ڈھال بنالیں تو کفار پر حملہ جائز ہے، اگرچہ ڈھال بنائے مسلمان بھی مارے جائیں۔ اس کے لیے امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے دو دلائل ذکر کیے ہیں۔ ایک دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طائف والوں کے قلعے پر منجنیق سے حملہ کرنا[101][102] اور دوسری سیدنا صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کفار پر شب خون مارنے کی اجازت دینا، چاہے اس میں ان کی عورتیں بچے مارے

---

[100] أحکام القرآن؛ ج۵، ص ۲۷۳

[101] طائف پر منجنیق سے حملہ کرنے کی روایت امام ترمذی رحمہ اللہ نے ثور بن یزید رحمہ اللہ سے مرسلاً اور امام ابو داود رحمہ اللہ نے اپنی مراسیل میں سیدنا مکحول رحمہ اللہ سے مرسلاً نقل کی ہے۔[منقول از مسئلۃ التترس؛ ص ۱۰]

[102] منجنیق سے حملہ کرنے کے دوسرے واقعات بھی صحابہ کرام سے مروی ہیں۔ جیسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں سیدنا ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کو اہل تستر پر منجنیق سے حملہ کرنے کا حکم فرمایا تھا، اور سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اسکندریہ پر منجنیق سے حملہ کیا تھا۔ ان واقعات کا ذکر امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السیر میں کیا ہے۔ دیکھیے: ج۴، ص ۲۲۲

جائیں۔[103] اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو 'اُبنیٰ' بستی پر شب خون مارنے اور بستی کے جلانے کا حکم دینا[104]۔

جواز کی علت

امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے جواز کے دلائل تو ذکر کیے ہیں، لیکن تعلیل بیان نہیں کی۔ تعلیل کے لیے ہم امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپ 'المبسوط' میں لکھتے ہیں:

ولا بأس بإرساله الماء إلى مدينة أهل الحرب وإحراقهم بالنارورميهم بالمنجنيق وإن كان فيهم أطفال أو ناس من المسلمين أسر أو تجاري وقال الحسن بن زياد رحمه الله تعالى إذا علم أن فيهم مسلم وأنه يتلف بهذا الصنع لم يحل له ذلك لأن الإقدام على قتل المسلم حرام وترك قتل الكافر جائز ألا ترى أن للإمام أن لا يقتل الأسارى لمنفعة المسلمين فكان مراعاة جانب المسلم أولى من هذا الوجه ولكن نقول أمرنا بقتالهم فلو اعتبرنا هذا المعنى أدى إلى سد باب القتال معهم فإن حصونهم ومدائنهم قل ما تخلو من مسلم عادة ولأنه يجوز لنا أن نفعل ذلك بهم وإن كان فيهم نساؤهم وصبيانهم وكما لا يحل قتل المسلم لا يحل قتل نسائهم وصبيانهم ثم لا يمتنع ذلك لمكان نسائهم وصبيانهم فكذلك لمكان المسلم فلا يستقيم منع هذا وقد روينا أن النبي صلى الله عليه وسلم نصب المنجنيق على الطائف وأمر أسامة بن زيد رضي الله عنه بأن يحرق وحرق حصن عوف بن مالك [النضري]۔ وكذلك إن تترسوا بأطفال المسلمين فلا بأس بالرمي إليهم وإن كان الرامي يعلم أنه يصيب المسلم وعلى قول الحسن رضي الله عنه لا يحل له ذلك وهو قول الشافعي لما بينا أن التحرز عن قتل المسلم فرض وترك الرمي إليهم جائزولكن نقول القتال معهم فرض وإذا تركنا ذلك لما فعلوا أدى إلى سد باب القتال معهم ولأنه يتضرر

---

[103] صحيح البخاري؛ ص ٢٤٢٧ [كتاب الجهاد والسير؛ باب أهل الدار يبيّتون، فيصاب الولدان والذراريّ]، صحيح مسلم؛ ص ٨٣٢ [كتاب الجهاد والسير؛ باب جواز قتل النساء والصبيان في البيّات]

[104] سنن ابن ماجه؛ ج٣، ص١٠٨ [أبواب الجهاد؛ باب التحريق بأرض العدو]

المسلمون بذلك فإنهم يمتنعون من الرمي لما أنهم تترسوا بأطفال المسلمين فيجترؤن بذلك على المسلمين وربما يصيبون منهم إذا تمكنوا من الدنو من المسلمين والضرر مدفوع۔[105]

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ تعلیل کو امام مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ 'ہدایہ' میں ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں:

ولا بأس برميهم وإن كان فيهم مسلم أسير أو تاجر لأن في الرمي دفع الضرر العام بالذب عن بيضة الإسلام وقتل الأسير والتاجر ضرر خاص، ولأنه قلما يخلو حصن من مسلم فلو امتنع باعتباره لانسد بابه وإن تترسوا بصبيان المسلمين أو بالأسارى لم يكفوا عن رميهم لما بينا۔[106]

احناف نے اس مسئلے میں جواز کی علت یہ بیان کی ہے کہ کفار کے قلعوں میں یا بستیوں میں بعضے مسلمانوں کا ہونا تو کسی حال میں بھی خارج از امکان نہیں ہے، اگر ہم اس وجہ سے کفار کے خلاف قتال ترک کردیں تو نتیجے میں قتال مطلقاً ترک ہو جائے گا اور کفار کا ضرر مسلمانوں سے دور کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ کفار کے خلاف قتال فرض ہے اور ان سے لڑ کر ان کے ضرر کو مسلمانوں سے رفع کرنا فرض ہے۔ اب جب چند مسلمانوں کے دفاع کی وجہ سے کفار کا ضرر غالب آجائے تو یہ جہاد کی فرضیت کے مقصد سے ہی روگردانی ہو جائے گی۔ اس وجہ سے ہم چند مسلمانوں کے مارے جانے کے ضرر کو برداشت کریں گے اور اس کے مقابلے میں کفار کے غلبے کے ضرر کو قتال کے ذریعے دفع کریں گے۔ جواز کی یہی بنیادی علت ہے جس کی وجہ سے دیگر فقہاء نے بھی مسئلہ تترس کا جواز بیان کیا ہے، گو الفاظِ بیان میں کچھ اختلاف ہو گا۔

مالکیہ میں سے امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قلت: قد يجوز قتل الترس، ولا يكون فيه اختلاف إن شاء الله، وذلك إذا كانت المصلحة ضرورية كلية قطعية. فمعنى كونها ضرورية: أنها لا يحصل الوصول إلى الكفار إلا بقتل الترس. ومعنى أنها كلية: أنها قاطعة لكل الأمة، حتى يحصل من قتل

---

105 المبسوط؛ ج۱۰، ص۶۴، ۶۵

106 الهداية شرح بداية المبتدی؛ ج۴، ص۲۲۴

الترس مصلحة كل المسلمين ، فإن لم يفعل قتل الكفار الترس واستولوا على كل الأمة. ومعنى كونها قطعية: أن تلك المصلحة حاصلة من قتل الترس قطعا. قال علماؤنا: وهذه المصلحة بهذه القيود لا ينبغي أن يختلف في اعتبارها، لأن الفرض أن الترس مقتول قطعا، فإما بأيدي العدو فتحصل المفسدة العظيمة التي هي استيلاء العدو على كل المسلمين. وإما بأيدي المسلمين فيهلك العدو وينجو المسلمون أجمعون. ولا يتأتى لعاقل أن يقول: لا يقتل الترس في هذه الصورة بوجه، لأنه يلزم منه ذهاب الترس والإسلام والمسلمين۔[107]

شوافع میں سے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ 'روضۃ الطالبین' میں فرماتے ہیں:

وإن دعت ضرورة إلى رميهم بأن تترسوا بهم في حال التحام القتال وكانوا بحيث لو كففنا عنهم ظفروا بنا وكثرت نكايتهم فوجهان : أحدهما لا يجوز الرمي إذا لم يمكن ضرب الكفار إلا بضرب مسلم ، لأن غايته أن نخاف على أنفسنا ، ودم المسلم لا يباح بالخوف بدليل صورة الإكراه ، والثاني وهو الصحيح المنصوص وبه قطع العراقيون جواز الرمي على قصد قتال المشركين ويتوقى المسلمين بحسب الإمكان، لأن مفسدة الإعراض أكثر من مفسدة الإقدام، ولا يبعد احتمال طائفة للدفع عن بيضة الإسلام ومراعاة للأمور الكليات۔[108]

شوافع ہی میں سے علامہ شربینی رحمۃ اللہ علیہ 'مغني المحتاج' میں لکھتے ہیں:

(فإن كان فيهم مسلم أو أسير أو تاجر) أو نحوه (جاز ذلك) أي الرمي بما ذكر وغيره (على المذهب) لئلا يتعطل الجهاد لحبس مسلم عندهم، وقد لايصيب المسلم وإن أصيب رزق الشهادة۔[109]

حنابلہ میں سے امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ 'المغني' میں لکھتے ہیں:

---

107 الجامع لأحکام القرآن؛ج۱۹، ص ۳۳۳

108 روضۃ الطالبین؛ج۱۰، ص۲۴۶

109 مغني المحتاج؛ج۴، ص۲۹۶

فَصْلٌ: وَإِنْ تَتَرَّسُوا فِي الْحَرْبِ بِنِسَائِهِمْ وَصِبْيَانِهِمْ، جَازَ رَمْيُهُمْ، وَيَقْصِدُ الْمُقَاتِلَةَ: {لِأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَمَاهُمْ بِالْمَنْجَنِيقِ وَمَعَهُمْ النِّسَاءُ وَالصِّبْيَانُ}، وَلِأَنَّ كَفَّ الْمُسْلِمِينَ عَنْهُمْ يُفْضِي إلَى تَعْطِيلِ الْجِهَادِ، لِأَنَّهُمْ مَتَى عَلِمُوا ذَلِكَ تَتَرَّسُوا بِهِمْ عِنْدَ خَوْفِهِمْ فَيَنْقَطِعُ الْجِهَادُ۔[110]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وقد اتفق العلماء على أن جيش الكفار إذا تترسوا بمن عندهم من أسرى المسلمين، وخيف على المسلمين الضرر إذا لم يقاتلوا، فإنهم يقاتلون وإن أفضى ذلك إلى قتل المسلمين الذين تترسوا بهم۔[111]

مبحث دوم: مسئلے کی عملی تطبیق کی قیود وشروط

جو علت فقہاء کی عبارات سے ہمیں معلوم ہوئی ہے، وہ قتلِ تترس کے مطلق جواز کی ہے۔ باقی عملی میدان میں کون سی صورتوں میں یہ علت جواز کو لازم کرتی ہے، اس کی تفصیل بھی فقہاء نے بیان کی ہے۔ یعنی عملی میدان کی صورتحال کے موافق فقہاء نے بعض شروط عائد کی ہیں۔ اس میں اور اصلِ علت میں اشتباہ پیدا نہیں ہونا چاہیے، اور نہ ہی عملی صورتحال دیکھے بغیر مطلق جواز کو بنیاد بنا کر قتل میں تعمیم کی گنجائش ہے۔ کیونکہ بہر کیف ایک مسلمان کی حرمت قطعی ہے اور اس کا قتل سوائے ضرورت کی حالت کے جائز نہیں۔ اسی ضرورت کی حالت کا تعین فقہاء کی بیان کردہ شروط سے ہوتا ہے۔ شیخ ابو یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وما يظهر لي - والله تعالى أعلم - فيما يتعلق بحالة الأضرار أو خوف الضرر الذي عُلق به الحكم وهو جواز رمي الترس إن تحصّله يمكن أن يقسم إلى قسمين : الأول منهما : هو ما كنا نتحدث عنه وهو الضرر العام الشامل الكلي المتعلق بعموم

---

[110] المغني؛ ج ۸، ص ۳۰۹

[111] مجموع الفتاوى؛ ج ۲۸، ص ۲۹۸

تسلط الكفار على ديار المسلمين ، وهذا يرتبط بأصل قيام الجهاد ضدهم وهو من أهم أسباب تعينه في هذا الزمان... وأما القسم الثاني من أقسام الضرر الواقع على المسلمين فهو ما يتعلق بكل عملية عسكرية على حدة والتي تدخل في مجمل العمل الجهادي العام وتعتبر فرداً من أفراده وجزئية من جزئياته ، وذلك يتطلب أموراً كثيرة في تقدير ذلك الضرر ومدى قوة تحققه من هذا الهدف على التعيين ، وعن إمكانية إزالته بهذه الطريقة وانحصارها فيها بحيث لا يتأتى التوصل إليه إلا بها ، وفي هذا تتعدد أوجه النظر وتختلف الاجتهادات ، ولهذا فلا يكفي - فيما يظهر والله أعلم - التعليل بخوف الضرر العام الشامل الواقع من احتلال الكفار لبلدان المسلمين واعتبار حالات وجود أفراد الاحتلال جميعها بين المسلمين هي من قبيل مسألة الترس التي ذكرها الفقهاء، بل لا بد من النظر في كل حالة بعينها وحصر المصالح المتوخاة من ورائها ومعرفة مدى الأضرار الحقيقة التي يراد إزالتها من الهدف المقصود في تلك العملية وذلك مع استحضار الضوابط والقيود التي ذكرها الفقهاء.[112]

ہم یہاں فقہائے احناف کی بیان کردہ قیود کا ذکر کریں گے، جو ہمیں ان کی عبارات سے معلوم ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ذیل میں دیگر فقہاء کی بیان کردہ قیود کی احناف کی بیان کردہ قیود سے موافقت ذکر کریں گے۔

فقہائے احناف کی عبارات میں غور کرنے سے درج ذیل تین قیود واضح ہوتی ہیں:

پہلی قید: کفار پر فتح پانے کی کوئی دوسری صورت نہ ہو

سب سے پہلی واضح قید جو امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السیر الکبیر میں بیان کی ہے، وہ یہ ہے کہ کفار پر فتح پانے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ ہو۔ یا ذریعہ تو ہو مگر اس میں انتہائی مشقت اور سخت حرج ہو۔

شرح السیر میں لکھا ہے:

قَدْ بَيَّنَّا أَنَّهُ لَا بَأْسَ بِتَحْرِيقِ حُصُونِهِمْ وَتَغْرِيقِهَا مَا دَامُوا مُمْتَنِعِينَ فِيهَا، سَوَاءٌ كَانَ

[112] مسئلة التترس في الجهاد المعاصر؛ ص۲۳، ۲۴

فِيهَا قَوْمٌ مِنْ الْمُسْلِمِينَ أُسَرَاءَ أَوْ مُسْتَأْمَنِينَ أَوْ لَمْ يَكُونُوا، وَالْأَوْلَى لَهُمْ إذَا كَانُوا يَتَمَكَّنُونَ مِنْ الظَّفَرِ بِهِمْ بِوَجْهٍ آخَرَ أَلَّا يُقْدِمُوا عَلَى التَّغْرِيقِ وَالتَّحْرِيقِ.
لِأَنَّ فِي ذَلِكَ إتْلَافَ مَنْ فِيهَا مِنْ الْمُسْلِمِينَ إنْ كَانُوا وَإِنْ لَمْ يَكُونُوا، فَفِي ذَلِكَ إتْلَافُ أَطْفَالِهِمْ وَنِسَائِهِمْ، وَذَلِكَ حَرَامٌ شَرْعًا، فَلَا يَجُوزُ الْمَصِيرُ إلَيْهِ إلَّا عِنْدَ تَحَقُّقِ الضَّرُورَةِ، وَالضَّرُورَةُ فيه أَلَا يَكُونَ لَهُمْ طَرِيقٌ آخَرُ يَتَمَكَّنُونَ مِنْ الظَّفَرِ بِهِمْ بِذَلِكَ الطَّرِيقِ، أَوْ يَلْحَقُهُمْ فِي الطَّرِيقِ الْآخَرِ حَرَجٌ عَظِيمٌ وَمَئُونَةٌ شَدِيدَةٌ، فَحِينَئِذٍ لِدَفْعِ هَذِهِ الْمَئُونَةِ يُبَاحُ لَهُمْ التَّحْرِيقُ، وَمِنْ ضَرُورَةِ ثُبُوتِ الْإِبَاحَةِ مُطْلَقًا مَعَ الْعِلْمِ بِالْحَالِ أَلَّا يَلْزَمَهُمْ دِيَةٌ وَلَا كَفَّارَةٌ؛ لِأَنَّ وُجُوبَ ذَلِكَ بِاعْتِبَارِ قَتْلٍ مَحْظُورٍ وَهَذَا قِتَالٌ مَأْمُورٌ بِهِ فَلَا يَكُونُ مُوجِبًا دِيَةً وَلَا كَفَّارَةً. وَالسَّفِينَةُ فِي ذَلِكَ كُلِّهِ بِمَنْزِلَةِ الْحِصْنِ فِي جَمِيعِ مَا ذَكَرْنَا، وَكَذَلِكَ إنْ تَتَرَّسُوا بِأَطْفَالِ الْمُسْلِمِينَ۔[113]

یہاں کوئی تین اعتراضات کر سکتا ہے:

اول: اس عبارت میں امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ تترس کی اختیاری صورت [یعنی کفار کے قلعے پر عمومی حملے] کی قید بیان کر رہے ہیں، اضطراری صورت [یعنی مسلمانوں کو ڈھال بنانے] کا حکم مختلف ہو گا۔ جواباً عرض ہے کہ ایسی بات نہیں ہے، ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ احناف نے تترس کی اختیاری صورت کے حکم کی بنیاد پر اضطراری صورت کا حکم بیان کیا ہے۔ پس جو قید اختیاری صورت پر عائد ہو گی، وہ اضطراری پر بھی عائد ہو گی۔ اس عبارت کے آخر میں بھی امام سرخسی رحمہ اللہ نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ کفار کی کشتی کا حکم جس میں بعض مسلمان قیدی ہوں یا مسلمان بچوں یا قیدیوں کے ڈھال بنانے کی صورت کا حکم قلعے والا ہے۔ پھر عملی میدان میں بھی یہ بات قابلِ عمل ہے، ایسے میں اسے محدود کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

دوم: یہاں امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ حکم اس منجنیق کے استعمال کا بیان فرما رہے ہیں جس کے ذریعے آگ دشمن کے قلعوں پر برسائی جائے۔ اس کی قید ذکر فرما رہے ہیں، منجنیق سے عام پتھر برسانے کی نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس زمانے میں منجنیق کا استعمال دونوں طریقوں سے ہوتا تھا۔ بڑے پتھر بھی برسائے جاتے تھے اور آگ

[113] شرح السیر الکبیر؛ ج ۴، ص ۲۷٦

بھی برسائی جاتی تھی۔ جب فقہاء نے نصب المجانیق کا مسئلہ بیان فرمایا ہے تو یہ دونوں طریقوں کو شامل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس علت کے سبب یہاں تحریق کو مقید کیا گیا ہے، وہ کفار کی عورتوں بچوں اور مسلمانوں کا قتل ہو جانا ہے اور یہ دونوں حالتوں میں موجود ہے، چاہے پتھر برسائے جائیں یا آگ یا اسی طرح پانی چھوڑا جائے۔[114]

سوم: امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں اشتباہ پایا جاتا ہے، وہ ایک مقام پر اس قید کو جواز و عدمِ جواز کی قید نہیں بنا رہے، بلکہ اولیٰ و غیر اولیٰ کی قید ذکر کر رہے ہیں۔ اس کے جواب میں عرض ہے کہ متعین الفاظ سے حکم اخذ کرنے کی جو تحدید متاخرین نے بیان کی ہے، اس کی پابندی متقدمین کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ اُسی طرح جس طرح 'ينبغي' کا لفظ متقدمین کے یہاں وجوب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جبکہ متاخرین اس لفظ کو صرف استحباب کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور 'لا ينبغي' کو متقدمین حرمت کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں، جبکہ متاخرین صرف کراہتِ تنزیہی کے لیے۔[115] یہ معاملہ یہاں بھی ہے۔ امام سرخسی رحمہ اللہ نے لفظ 'أولی' کا استعمال کیا ہے، لیکن آگے چل کر عدمِ جواز کی وضاحت کر دی ہے، فرمایا: [فَلَا يَجُوزُ الْمَصِيرُ إِلَيْهِ إِلَّا عِنْدَ تَحَقُّقِ الضَّرُورَةِ]۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے کو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے رد المحتار میں عدمِ جواز ہی لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

---

[114] یہ اشتباہ حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ہوا ہے، آپ نے اعلاء السنن میں [باب نصب المنجنيق على الكفار] میں امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تعلیل پر اعتراض کیا ہے اور آگ برسانے کی قید کی علت تعذیب بالنار کو قرار دیا ہے۔ تاہم آپ کی یہ بات خود قابلِ تأمل ہے کیونکہ آگ سے جلانے کی ممانعت احناف و دیگر ائمہ کے نزدیک معین مقدور فرد کے ساتھ خاص ہے، غیر مقدور دشمن پر آگ کے ساتھ تعمیمی حملہ جائز ہے، جیسا کہ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السیر میں واضح فرمایا ہے۔ اس پر بھی مزید قید صرف اس علت کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ یہاں امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ جو منجنیق سے حملے کا حکم بیان فرما رہے ہیں، اس کے مقید ہونے کی تعلیل وہی ہے جو آپ نے بیان فرمائی ہے اور یہ حکم منجنیق سے ہر قسم کے حملے [بشمول آگ سے حملہ] کو شامل ہے، بلکہ ہر اس حملے کو شامل ہے جس میں غیر مقاتلین کے قتل میں تعمیم ہوتی ہو۔

[115] علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ رد المحتار میں لکھتے ہیں: **(ونهينا عن غدر الخ) عدل عن قول الهداية وغيرها: وينبغي للمسلمين أن لا يغدروا، لأن المشهور عند المتأخرين استعمال ينبغي بمعنى يندب ولا ينبغي بمعنى يكره تنزيها وإن كان في عرف المتقدمين استعماله في أعم ذلك۔** [رد المحتار؛ ج۶، ص۲۱۲]

لكن جواز التحريق والتغريق مقيد كما في شرح السير بما إذا لم يتمكنوا من الظفر بهم بدون ذلك، بلا مشقة عظيمة، فإن تمكنوا بدونها فلا يجوز، لأن فيه إهلاك أطفالهم ونسائهم ومن عندهم من المسلمين۔[116]

تنبیہ: شرح السیر میں چونکہ متن اور شرح میں فرق اب ناپید ہو چکا ہے اور شرح السیر کے جو نسخے بھی اب دستیاب ہیں، ان میں عبارت ایک ہی تسلسل میں جمع ہے جس میں ماتن اور شارح کی عبارت کو فرق کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی کیا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا عبارت میں بندے کے گمان میں اولی والی عبارت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، جس کی وضاحت بعد میں عبارت میں امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے عدمِ جواز سے کر دی ہے، واللہ اعلم۔

اس سے معلوم ہوا کہ

- کفار کے قلعے یا بستی پر... جہاں کفار کی عورتیں بچے یا مسلمان بھی ہوں... ایسا حملہ کرنا جس میں قتلِ عام ہوتا ہو... جیسا کہ پہلے زمانے میں منجنیق سے حملہ ہوتا ہے، آج فضا سے بم برسائے جاتے ہیں، بارود کی گاڑی سے حملہ ہوتا ہے یا مدفعیہ استعمال کیا جاتا ہے، اسی صورت میں جائز ہے جبکہ فتح کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہ ہو، یا ہو تو اس میں انتہائی مشقت ہو۔
- جب کفار اپنے سامنے بعض مسلمانوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کر رہے ہوں تو اگر ان پر حملے کی ایسی صورت موجود ہو جس میں ڈھال بنائے مسلمانوں کے قتل کے علاوہ فتح کا امکان ہو تو ان کا قتل جائز نہ ہو گا۔

اسی قید کا ذکر بعض دوسرے فقہاء کی عبارات میں بھی ملتا ہے۔ کہیں انھی لفظوں میں اور کہیں دوسری تعبیرات کے ساتھ۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ تو یہی الفاظ لکھ دیے:

وإن كانت ضرورة، كخوف ضررهم أو لم يحصل فتح القلعة إلا به، جاز قطعا۔[117]

امام قرطبی مالکی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن قدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارات میں یہ تعبیر ملتی ہے، کہ ایسی عملی صورت بن

---

[116] رد المحتار؛ ج۶، ص۲۱۰

[117] روضۃ الطالبین؛ ج۱۰، ص۲۴۵

جائے جس میں ڈھال بنائے گئے مسلمانوں کے قتل کے سوا کوئی چارہ ہی نہ ہو دشمن تک پہنچنے کا، تو اس میں ان کا قتل جائز ہو گا۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قلت: قد يجوز قتل الترس، ولا يكون فيه اختلاف إن شاء الله، وذلك إذا كانت المصلحة ضرورية كلية قطعية. فمعنى كونها ضرورية: أنها لا يحصل الوصول إلى الكفار إلا بقتل الترس۔[118]

امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَإِنْ تَتَرَّسُوا بِمُسْلِمٍ، وَلَمْ تَدْعُ حَاجَةٌ إِلَى رَمْيِهِمْ، لِكَوْنِ الْحَرْبِ غَيْرَ قَائِمَةٍ، أَوْ لِإِمْكَانِ الْقُدْرَةِ عَلَيْهِمْ بِدُونِهِ، أَوْ لِلْأَمْنِ مِنْ شَرِّهِمْ، لَمْ يَجُزْ رَمْيُهُمْ.[119]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قید سے ایک اور نکتہ یہ نکالا ہے کہ فتح کا حصول فوری حملے سے وابستہ ہو۔ وگرنہ بالفرض حملے میں تاخیر کا امکان موجود ہو کہ کسی دوسرے وقت حملہ کر کے فتح حاصل کر لیں گے تو ایسے میں قتل جائز نہ ہو گا۔ آپ لکھتے ہیں:

لو تترس الكفار بمسلمين من الأسارى وغيرهم نظر إن لم تدع إلى رميهم واحتمل الحال الإعراض عنهم لم يجز رميهم۔[120]

امام نووی رحمہ اللہ کی بیان کردہ یہ قید امام سرخسی رحمہ اللہ کی قید کی ایک عملی تطبیق ہے۔

دوسری قید: مسلمان اور کفار کی تمیز عملاً ممکن نہ ہو

دوسری قید جو امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کی ہے، وہ یہ ہے کہ جب عملاً مسلمانوں اور کفار کے درمیان تمیز ممکن نہ رہے۔ اس شرط کا خاص تعلق ڈھال بنانے والی صورت سے ہے، کیونکہ قلعے پر عمومی حملے کی صورت میں بالعموم عدمِ تمیز متحقق ہوتی ہے۔ آپ شرح السیر الکبیر میں لکھتے ہیں:

وَكَذَلِكَ لَوْ تَتَرَّسُوا بِأَطْفَالِ الْمُسْلِمِينَ فَأَصَابَهُمْ الْمُسْلِمُونَ بِالرَّمْيِ إلَّا أَنَّ الْمُسْتَحَبَّ لَهُمْ

[118] الجامع لأحکام القرآن؛ ج۱۹، ص ۳۳۳

[119] المغني؛ ج۸، ص ۳۱۰

[120] روضۃ الطالبین؛ ج۱۰، ص ۲۴۶

أَلَّا يَقْصِدُوا الْمُسْلِمِينَ بِذَلِكَ ؛ لِأَنَّهُمْ لَوْ قَدَرُوا عَلَى التَّحَرُّزِ عَنْ إصَابَةِ الْمُسْلِمِينَ فِعْلًا كَانَ عَلَيْهِمْ أَنْ يَتَحَرَّزُوا عَنْ ذَلِكَ ، وَإِذَا عَجَزُوا عَنْ ذَلِكَ كَانَ عَلَيْهِمْ التَّحَرُّزُ بِالْقَصْدِ وَالنِّيَّةِ، لِأَنَّ ذَلِكَ فِي وُسْعِهِمْ.

معلوم ہوا کہ تترس کی صورت اسی وقت متحقق ہو گی جب لڑائی میں ڈھال بنائے گئے مسلمانوں کا کفار سے امتیاز عملاً ممکن نہ رہے، جیسا کہ ڈھال بنائے گئے مسلمان کفار کی صف میں نظر آ رہے ہوں اور کفار کو نشانہ بنانے میں انھیں کفار سے الگ کرنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ اسی وقت کفار پر ایسا حملہ جائز ہو گا، جس میں چاہے مسلمان بھی مارے جائیں۔

تاہم اس وقت بھی مجاہدین پر لازم ہے کہ وہ مسلمانوں کے قتل کا ارادہ نہ کریں، بلکہ ارادہ کفار کے قتل کا ہی کریں۔ 'ہدایہ' میں لکھا ہے:

ويقصدون بالرمي الكفار لأأنه إن تعذر التمييز فعلا فلقد أمكن قصدا والطاعة بحسب الطاقة۔[121]

ایسی صورت میں ارادہ کافروں کے قتل کا کرنے کی قید حنابلہ نے بھی لگائی ہے۔[122]

ائمہ شوافع نے بھی جواز کی حالت میں مسلمان کو از حدِ امکان بچانے کی قید لگائی ہے، یعنی جہاں امتیاز ممکن ہو، وہاں مسلمان کے قتل سے بچا جائے۔ علامہ شربینی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

...(وإلا) بأن دعت ضرورة إلى رميهم بأن تترسوا بهم حال التحام القتال بحيث لو كففنا عنهم ظفروا بنا وكثرت نكايتهم (جاز رميهم) حينئذ (في الأصح) المنصوص ويقصد بذلك قتال المشركين ونتوقى في المسلمين وأهل الذمة بحسب الإمكان۔[123]

تیسری قید: ضررِ عام اور ضررِ خاص میں موازنہ

تیسری شرط جو احناف کی عبارات میں واضح الفاظ میں نہیں لکھی گئی، تاہم ان کی بیان کردہ تعلیل سے اخذ ہوتی

---

121 الهداية؛ ج۴، ص۲۲۴

122 دیکھیے: کشاف القناع؛ ج۲، ص۳۷۸

123 مغني المحتاج؛ ج۴، ص۲۹۷

ہے، وہ یہ ہے کہ عملی میدان میں ضررِ خاص اور ضررِ عام کا موازنہ کیا جائے۔ ہم اوپر ہدایہ کی عبارت میں پڑھ آئے ہیں کہ تترس کا جواز ہی اس علت کی بنیاد پر ہے کہ ضررِ عام جو ترکِ جہاد کی صورت میں غلبہ کفار ہے، اس کے دفع کرنے کے لیے ہم ضررِ خاص یعنی بعض مسلمانوں کے قتل کو برداشت کریں گے۔ اسی علت کی وجہ سے تترس میں قتلِ مسلم جائز ہے۔ اس علت کا تقاضا ہے کہ قتلِ تترس کی تطبیق کے وقت میدان میں ضررِ خاص اور ضررِ عام کا موازنہ کیا جائے۔ اس موازنے کے نتیجے میں اگر عملی واقعہ میں معلوم ہو کہ ضررِ خاص کے برداشت کرنے پر بھی ضررِ عام دفع نہیں ہو رہا، تو اس ایک واقعے میں قتلِ تترس جائز نہ ہو گا۔ چنانچہ

- اگر کسی جگہ ایک معرکے میں کفار بعض مسلمانوں کو ڈھال بنالیں، اور مجاہدین کی قلتِ تعداد کے سبب یہ نظر آرہا ہو کہ چاہے مجاہدین ڈھال بنائے گئے مسلمانوں کو قتل کریں یا نہ کریں، انھیں پسپا ہونا پڑے گا، تو ان مسلمانوں کا قتل جائز نہ ہو گا۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ قید ان الفاظ میں ذکر کی ہے کہ قتلِ تترس اسی وقت جائز ہے جب غالب گمان ہو کہ اس طرح کفار پر فتح حاصل ہو جائے گی۔ آپ لکھتے ہیں:

ومعنى كونها قطعية: أن تلك المصلحة حاصلة من قتل الترس قطعا۔[124]

- اسی طرح اگر کسی معرکے میں حملہ کرنے سے کفار کا نقصان کم اور مسلمانوں کا قتلِ عام ہو تو یہ جائز نہ ہو گا۔

تنبیہ: جس بستی میں مسلمانوں کی اکثریت اور کفار کی قلت ہو، وہاں شب خون مارنے اور قتل میں تعمیم کی ممانعت

یہاں یہ نکتہ بھی جان لینا فائدے سے خالی نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جہاں روایات میں کفار کی بستیوں پر شب خون مارنے اور عمومی حملے کی اجازت منقول ہے، وہیں روایات میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی بستی پر شب مارنے کا ارادہ فرماتے تو سحری تک انتظار کرتے اور دیکھتے کہ کہیں اذان کی آواز تو نہیں آرہی۔ اگر اذان کی آواز سنائی نہ دیتی تو حملہ فرماتے۔ یہ حکم آپ ﷺ اپنے اصحاب سے بھی فرماتے۔

124 الجامع لأحكام القرآن؛ ج۱۹، ص ۳۳۳

کتبِ صحاح میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

كَانَ الرسول (صلى الله عليه وسلم) إِذَا غَزَا قَوْمًا لَمْ يُغِرْ حَتَّى يُصْبِحَ، فَإِنْ سَمِعَ أَذَانًا أَمْسَكَ، وَإِنْ لَمْ يَسْمَعْ أَذَانًا أَغَارَ بَعْدَ مَا يُصْبِحِ۔[125]

سیدنا عصام مزنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا بَعَثَ جَيْشًا أَوْ سَرِيَّةً يَقُولُ لَهُمْ: إِذَا رَأَيْتُمْ مَسْجِدًا أَوْ سَمِعْتُمْ مُؤَذِّنًا فَلَا تَقْتُلُوا أَحَدًا۔[126]

ان روایات کا عام معنی جو شارحین نے بیان فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ جب کسی بستی میں اذان سنائی دے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ بستی والے مسلمان ہیں، تو اب مسلمانوں پر حملہ جائز نہیں ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ کسی بستی میں اذان سنائی دینے کا مطلب ہے کہ یہ دار الاسلام ہے۔[127] امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ان روایات کے لیے اپنی سنن کبریٰ میں باب باندھا ہے: **باب الاِحْتِيَاطِ فِي التَّبْيِيتِ وَالإِغَارَةِ لِئَلاَّ يُصِيبَ مُسْلِمِينَ بِجَهَالَةٍ۔**[128]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان روایات کا یہ مقصود ہے کہ اذان سے معلوم ہوتا ہے کہ بستی میں مسلمان ہیں، جن پر حملہ جائز نہیں۔ تاہم ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے اصحاب کو حملے کے لیے روانہ کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بستیاں ایسی تھیں جو کفار کے علاقوں میں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر حملے کے لیے روانہ کیا گیا، تاہم اس بات کا امکان وہاں ہر علاقے میں موجود تھا کہ ان بستیوں میں سے بعض لوگ مسلمان ہو گئے ہوں، لیکن مدینہ کی طرف ہجرت نہ کی ہو۔ ایسی صورت عام موجود تھی۔ اسی سبب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم فرمایا کہ آپ کے اصحاب جب کسی بستی پر حملہ کرنے لگیں تو دیکھیں کہ اذان سنائی دیتی

---

125 صحيح البخاري؛ ص۲۷۷[کتاب الجهاد والسير؛ باب دعا النبي صلی اللہ علیہ وسلم الناس إلى الإسلام]، صحيح مسلم؛ ص۱۷۹[کتاب الصلوة؛ باب إمساك عن الإغارة على قوم دار الكفر]۔ حدیث کے الفاظ صحیح بخاری کے ہیں۔

126 سنن أبي داود؛ ص۲۹۷[کتاب الجهاد؛ باب في دعاء المشركين]، جامع الترمذي؛ ص۳۶۶[کتاب السير؛ باب ماجاء في الدعوة قبل القتال]

127 اس حدیث کی شرح اور مزید اقوال جاننے کے لیے دیکھیے: فتح الباري لابن رجب الحنبلي؛ ج۵، ص۲۳۱ تا ۲۴۰

128 السنن الكبرى للبيهقي؛ ج۹، ص۱۸۲

ہے یا نہیں۔ لیکن یہ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ اذان ہونے کا مطلب ہے کہ بستی کے سارے لوگ مسلمان ہو گئے۔ ایسا کیس بستی کے متعلق ہوتا تو اس کی خبر اس دور میں بھی رسول اللہ ﷺ کو بروقت ہو جانا محال نہ تھا۔ ہمارے نزدیک ان روایات کا محل یہ ہے کہ جب کفار کی بستیوں میں اس قدر مسلمانوں کا وجود معلوم ہو جاتا کہ وہاں وہ اذان دیں اور نماز پڑھیں، تو ان مسلمانوں کی تعدادِ کثیر ہونے کی وجہ سے ایسی بستیوں پر بھی رسول اللہ ﷺ نے عمومی حملے سے اور شب خون مارنے سے روکا، کہ کہیں دیگر کافروں کے ہمراہ زیادہ تعداد میں مسلمان نہ مارے جائیں۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے علاقہ 'خثعم' کی طرف سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو وہاں لوگ اپنی جان بچانے کے لیے سجدہ کرنے لگے [یعنی وہ اس ذریعے سے اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرنے لگے]۔ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد بھی ان میں سے بعض کو قتل کر دیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے مقتولین کے بدلے میں نصف دیت ادا کی[129] اور فرمایا:

أنا بريء من كل مسلم أقام مع المشركين۔[130]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کافروں کی ایسی بستیاں تھیں جہاں مسلمان بھی انھی کے ہمراہ رہتے تھے اور ان کی تعداد بھی کم نہ تھی۔

پس مذکورہ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی ایسی بستیاں جہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد ہو اور عمومی حملے میں ان مسلمانوں کی بڑی تعداد کے مارے جانے کا امکان ہو تو یہ جائز نہ ہو گا اور یہ کفار کے قلعوں پر ایسے

---

[129] فقہاء کی وضاحت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا نصف دیت ادا کرنا تطوعاً تھا، یعنی تالیفِ قلب کے لیے تھا۔ وگرنہ اس حالت میں کوئی دیت لازم نہیں آتی۔ احناف کے نزدیک مسلمِ حربی کے قتل کے سبب اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قاتل کو معلوم نہ ہونے کے سبب۔ یہ مسئلہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ دیکھیے؛ أحکام القرآن للجصاص؛ ج۳، ص۲۱۷، دیکھیے؛ السنن الکبری للبیہقي؛ باب ماجاء في وجوب الکفارۃ في أنواع الخطأ، ج۸، ص۲۲۵۔

[130] سنن أبي داود؛ ص۲۹۸ [کتاب الجھاد؛ باب النھي عن قتل من اعتصم بالسجود]، جامع الترمذي؛ ص۳۷۸ [کتاب السیر؛ باب ماجاء في کراھیۃ المقام بین أظھر المشرکین] یہ روایت سیدنا جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

حملوں کی صورت سے خارج ہے جس کے نتیجے میں قتل میں تعمیم ہو، جسے ہم نے اوپر تترس کی اختیاری صورت کہا ہے۔ کیونکہ اس میں فقہاء کی تصریح موجود ہے کہ بالعموم کفار کی بستیوں اور قلعوں میں کچھ نہ کچھ مسلمان موجود رہتے ہیں... چاہے تجار کی شکل میں یا قیدیوں کی شکل میں۔ نہ کہ وہاں مسلمانوں کی خاصی تعداد آباد ہوتی ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

اس مسئلے کی یہ تصریح علمائے احناف کے یہاں تو نہیں ملی، البتہ ائمہ شوافع کی کتب میں مل جاتی ہے۔ علامہ شربینی رحمۃ اللہ علیہ 'مغني المحتاج' میں لکھتے ہیں:

وكالمسلم الطائفة من المسلمين كما قاله الرافعي، وقضيته عدم الجواز إذا كان في المسلمين كثرة وهو كذلك۔[131]

مبحث سوم: موجودہ دور میں مسئلہ تترس کی تطبیق اور رہنما ضوابط

یہاں تک ہم دیکھ آئے ہیں کہ کفار کے خلاف جنگ میں کن صورتوں اور کن قیود کے ساتھ بعض مسلمانوں کے قتل کا ضرر برداشت کیا جائے گا۔ تاہم کسی خاص معرکے یا خاص کارروائی میں ان قیود اور شروط کو منطبق کرنا میدانی صورتحال کو دیکھ ہی ممکن ہوتا ہے۔ یہ بات احاطہ امکان میں نہیں ہے کہ کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی خطے میں تترس کی تمام صورتوں کو متعین کر دیا جائے اور ان میں سے جائز اور ناجائز کا فیصلہ کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاہدین کے امراء پر لازم ہے کہ وہ جنگی معرکوں میں میدانی صورتحال کا جائزہ لیں اور مذکورہ بالا قیود کو ملحوظ رکھ کر اقدام کا فیصلہ کریں۔ اور اس سب میں بنیادی کردار کا حامل؛ امراء و علماء کا تقوی ہے، کہ یہ دونوں طبقات ایسے ہر قدم پر اللہ سے ڈرتے ہوئے اور اسی سے مانگتے ہوئے فیصلہ کریں۔ شیخ ابو یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ تترس کے تمام جوانب بیان کرنے کے بعد فیصلے کی بابت فرماتے ہیں:

وجِماع هذه الأمور كلها في قول الله تعالى: ﴿فاتقوا الله ما استطعتم﴾۔[132]

---

131 مغني المحتاج؛ ج۴، ص۲۹۶

132 مسئلة التترس في الجهاد المعاصر؛ ص۳۲

بلاشبہ مسئلے کی حتمی تحدید تو میدان میں ہی ہوتی ہے اور جنگوں میں حالات کی اونچ نیچ دیکھتے ہوئے صد فی صد صورتوں اور ان کے جواز وعدمِ جواز کا تعین ممکن نہیں ہے۔ لیکن موجودہ دور میں دشمن کی چالوں اور عمومی صورتحال کو مدِ نظر رکھ کر بعض ضوابط کی پابندی ضروری ہے۔اسی کی تفصیل ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

اول: کسی بھی واقعے میں مسئلہ تترس کی تطبیق کے لیے تین عناصر کی جانچ ضروری ہے:

1. **جنگ میں تترس کی کیا نوعیت ہے؟**

یعنی یہ دیکھا جائے کہ جنگ میں کس صورت میں مسلمانوں کو کفار ڈھال بنارہے ہیں۔موجودہ دور میں اس کی درج ذیل صورتیں ہیں:

الف) کفار حملہ کرتے ہوئے حقیقی معنی میں اپنے سامنے مسلمانوں کو ڈھال بنالیں، اور ان کی اوٹ میں حملہ آور ہوں۔

ب) کفار کی بستیوں میں بعض مسلمان بھی رہتے ہوں۔

ج) کفار کے کیمپوں میں بعض غیر محارب مسلمان بھی موجود ہوں۔

د) کفار کے کیمپ ایسی جگہوں پر ہوں جہاں آس پاس مسلمان آبادی ہے۔

ر) کفار کی آمدورفت ایسی جگہ پر ہے جہاں مسلمان بھی موجود ہیں۔اور یہاں انھیں نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔

2. **جنگ والے علاقے کی نوعیت کیا ہے؟**

موجودہ دور میں جنگ کے دو طرح کے علاقے ہیں۔

الف) کفری مغربی ممالک جہاں کفار کی اکثریت آباد ہے،ہاں اقلیت میں مسلمان بھی آباد ہیں۔

ب) مسلم ممالک... جہاں دین دشمن مرتد حکمران اور افواج قابض ہیں... اور جہاں بھاری اکثریت میں مسلمان آباد ہیں۔

3. **مجاہدین کس ہتھیار کی مدد سے حملہ کر رہے ہیں؟**

موجودہ دور میں دو نوعیت کے ہتھیار استعمال ہوتے ہیں:

الف) فردی ہتھیار [جسے فردی دفاع کا ہتھیار بھی کہا جاتا ہے]:یعنی جس کے ذریعے مجاہد دشمن پر دو بدو

حملہ کرتا ہے اور متعین افراد پر حملہ کرتا ہے۔ اس میں بندوق، پستول اور زیادہ سے زیادہ راکٹ شامل ہے۔ پہلے زمانے میں تلوار، نیزہ یا تیر استعمال ہوتا تھا۔

ب) قتل میں تعمیم کرنے والے ہتھیار: اس کے ذریعے دشمن کے متعین افراد کو ہدف نہیں بنایا جاتا، بلکہ ایسے حملہ ہوتا ہے کہ جس سے قتل میں تعمیم ہوتی ہے۔ جیسے موجودہ دور میں مدفعیہ، مائن اور بارودی گاڑی وغیرہ کے ذریعے حملہ کیا جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں منجنیق وغیرہ استعمال ہوتی تھی۔ فضائی طیارے سے بمباری بھی اسی میں شامل ہے۔ تاہم اس وقت دنیا میں موجود مجاہدین کے ہاتھ میں ایسی صلاحیت نہیں، جن کے ہاتھ میں ہے انھیں شریعت کے حکم کی پرواہ نہیں، بلکہ وہ خود شریعت کے دشمن ہیں۔

دوم: مذکورہ بالا عناصر کی جانچ کے نتیجے میں درج ذیل صورتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں:

الف) اگر کفار حملہ کرتے ہوئے حقیقی معنی میں بعض مسلمانوں کو اپنے سامنے ڈھال بنالیں اور کفار پر فتح کی کوئی دوسری صورت نہ ہو تو اب چاہے یہ کفری ممالک میں ہو یا مسلم ممالک میں... تترس کے حکم میں آئے گا۔ اور مجاہدین جس نوعیت کے ہتھیار سے بھی حملہ کریں، جائز ہو گا۔

ب) کفار کی بستیوں میں بعض مسلمان بھی رہتے ہوں اور ضرورت ان کفار پر حملے کی متقاضی ہو، تو یہ جائز ہو گا۔ یہ صورت بالعموم کفری ممالک میں موجود ہے، مسلم ممالک میں نہیں۔ اس صورت میں جس نوعیت سے بھی حملہ ہو، جائز ہو گا۔

ج) کفار کے کیمپوں میں بعض غیر محارب مسلمان بھی موجود ہوں۔ اس کا حکم پچھلی صورت کے حکم کے موافق ہو گا۔ چاہے یہ کیمپ کفری ممالک میں ہوں یا مسلم ممالک میں، اور مجاہدین جس نوعیت کے ہتھیار سے بھی حملہ آور ہوں۔

د) کفار کے کیمپ ایسی جگہ ہیں، جہاں آس پاس مسلمان آباد ہیں۔ اس صورت میں تفصیل ہے:

- اگر حملہ سادے ہتھیار سے ہو تا باہر موجود مسلمانوں کا دفاع ممکن ہے، ایسے میں انھیں قتل کرنا جائز نہ ہو گا۔
- اگر سادے ہتھیار سے کیمپ فتح کرنا ممکن نہ ہو اور قتل میں تعمیم والا ہتھیار استعمال کرنا پڑے تو

- اگر اس حملے میں غالب امکان ہو کہ زیادہ نقصان کیمپ میں ہو گا، باہر کے مسلمانوں کے نقصان کا اندیشہ ہو، تو ضرورت کے وقت یہ حملہ جائز ہو گا۔
- اگر اس حملے میں غالب امکان ہو کہ باہر کے مسلمانوں کا نقصان زیادہ ہو گا، کیمپ میں نقصان کم ہو گا، تو یہ حملہ جائز نہ ہو گا۔

اس صورت کا زیادہ تعلق مسلم ممالک سے ہے، وگرنہ مغربی ممالک میں ایسی صورت کم ہی واقع ہے۔

ر) کفار و مرتدین کی آمد و رفت ایسی جگہ ہو، جہاں مسلمان بھی موجود ہوں تو اس میں تفصیل ہے:

- اگر یہ صورت کفری مغربی ممالک میں ہو جہاں کفار کی آمد ورفت کی جگھوں پر بعض مسلمان موجود ہوں اور ان کفار پر حملہ ناگزیر ہو، تو ان پر ہر دو قسم کے ہتھیار سے حملہ جائز ہو گا۔
- اگر مسلم ملکوں میں یہ صورت ہو کہ مرتدین کی آمد ورفت کی جگھوں پر مسلمان موجود ہوں اور ان کا ہجوم ہو... جیسے شاہراہِ عام اور بازار وغیرہ... ایسی جگھوں پر حملہ جائز نہ ہو گا، کیونکہ اس میں غالب گمان ہے کہ مسلمانوں کا قتلِ عام ہو جائے گا۔
- اگر مسلم ملکوں میں ایسی جگہ مرتدین کی آمد و رفت ہو جہاں مسلمانوں کا ہجوم نہ ہو، گو بعض مسلمانوں کا گزر ممکن ہو تو ایسے میں سادے ہتھیار سے ان مرتدین پر حملہ جائز ہو گا، تاکہ کسی مسلمان کو بھی ضرر نہ پہنچے۔
- اگر سادے ہتھیار سے حملہ ممکن نہ ہو اور حملہ انتہائی ناگزیر ہو، دشمن کو نشانہ بنانے کی کوئی دوسری صورت نہ ہو تو اس وقت اس کے سوا دوسرے ہتھیار سے بھی حملہ جائز ہو گا، بشرطیکہ ایسے وقت ہو جب مسلمان کم سے کم ہوں۔

موجودہ دور میں جنگ کی صورتحال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مجاہدین کی رہنمائی کے لیے یہ ضوابط ذکر کیے ہیں۔ باقی ہر انسان کو افراط اور تفریط دونوں سے بچنا لازم ہے۔ جنگ کا یہ لازمی عنصر ہے کہ اس میں دشمن کا تعین کر کے اسے نشانہ بنانا ہر حال میں ممکن نہیں ہوتا، اسی لیے تترس میں قتلِ مسلم کا جواز علمائے کرام نے دیا۔ اب اگر کوئی اس جائز قتل سے بچنے کے لیے قتال ہی ترک کر دے اور عسکری عملیات کا دروازہ بند کر لے تو یقیناً یہ دین

کے احکام پر عمل کرنے والا نہیں ہے۔ جبکہ دوسری طرف اگر کوئی اسی تترس میں قتلِ مسلم کا جواز لیتے ہوئے اس کے اطلاق میں توسع اختیار کرے، اور فقہاء کی بیان کردہ قیود کی پابندی اور میدان کے مصالح ومفاسد کے موازنے کے بغیر کفار پر ہر قسم کے حملے کو جائز کرلے جس میں مسلمانوں کا کتنا ہی قتل ہو جائے تو یہ بھی دین کے احکام پر عمل سے پہلی تہی کرنے والا ہے۔ ہم نے اس دور میں بعض گروہوں کی طرف سے تترس کے اطلاق میں بہت زیادہ توسع اور غلو دیکھا ہے، جو یقیناً افسوس ناک ہونے ساتھ ساتھ بہت زیادہ اصلاح اور توجہ کا متقاضی ہے۔

پس مجاہدین اور بالخصوص ان کے امراء وعلماء کو ان دونوں انتہاؤں سے بچنا اور ان کے درمیان اعتدال کو پکڑنا لازم ہے، تاکہ جنگ کو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے احکامات کے مطابق 'جہاد فی سبیل اللہ' کی شکل میں کیا جائے۔ اسی میں دنیا میں بھی غلبہ اسلام کی راہ ہموار ہوتی ہے اور آخرت میں بھی کامیابی کا زینہ طے ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں ایک مسلمان اور مجاہد کا مطمح نظر ہوتے ہیں۔ چنانچہ مجاہدین پر لازم ہے کہ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھیں کہ تترس کے تحت قتلِ مسلم کا جواز شریعت کا ایک استثنائی حکم ہے اور یہ استثناء فقہاء کی بیان کردہ قیود کے مطابق ہی متحقق ہوتی ہے۔ اس لیے ہر مجاہد کو چاہیے کہ وہ ان حدود سے باہر نہ نکلے اور ایک مسلمان کے خون کی حرمت کو دل میں بٹھائے، تاکہ وہ ناحق کسی مسلمان کے قتل سے اپنے ہاتھ رنگین کر کے اپنے لیے تباہی کا سامان نہ کرے۔

مبحث چہارم: قتلِ تترس میں دیت وکفارہ کا حکم، اور قتلِ خطا سے حدِ فاصل

احناف نے تترس کی حالت کو عدمِ تمییز کی حالت قرار دیا ہے، یعنی جس میں مجاہدین کے لیے کفار اور مسلمانوں کے درمیان عملاً تمییز کرنا مشکل ہو جائے۔ اسی عدمِ تمییز کی وجہ سے ائمہ احناف کہتے ہیں کہ مجاہدین حملہ کرتے ہوئے ارادہ کفار کے قتل کا رکھیں، تاکہ کم از کم مجاہد ارادے میں تو تمییز کرے۔ جب تمییز ممکن نہ ہو اور اقدام ناگزیر ہو... جس کی تفصیل اوپر ذکر ہو گئی ہے... تو قتلِ تترس میں مسلمان کے قتل پر کوئی دیت اور کفارہ عائد نہیں ہوتا، یعنی اس حالت میں جو مسلمان مجاہدین کے حملے میں مارے جائیں تو مجاہدین پر اس کے عوض دیت یا

کفارہ لازم نہیں آتا۔ اس کا سبب امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس صورت میں قتال کا یہ عمل مباح عمل ہے اور مباح عمل پر دیت و کفارہ واجب نہیں آتا۔ دیگر کتبِ احناف میں اس کی وجہ یہ بیان ہوئی ہے کہ یہ فرضِ جہاد کی ادائیگی کا عمل ہے اور فرض کی ادائیگی میں ضمان لازم نہیں آسکتا۔ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ 'المبسوط' میں لکھتے ہیں:

ولكنا نقول القتال معهم فرض وإذا تركنا ذلك لما فعلوا أدى إلى سد باب القتال معهم ولأنه يتضرر المسلمون بذلك فإنهم يمتنعون من الرمي لما أنهم تترسوا بأطفال المسلمين فيجترؤن بذلك على المسلمين وربما يصيبون منهم إذا تمكنوا من الدنو من المسلمين والضرر مدفوع إلا أن على المسلم الرامي أن يقصد به الحربي لأنه لو قدر على التمييز بين الحربي والمسلم فعلا كان ذلك مستحقا عليه فإذا عجز عن ذلك كان عليه أن يميز بقصده لأنه وسع مثله ولا كفارة عليه ولا دية فيما أصاب مسلما منهم لأنه أصابه بفعل مباح مع العلم بحقيقة الحال والمباح مطلقا لا يوجب عليه كفارة ولا دية۔[133]

'ہدایہ' میں لکھا ہے:

وما أصابوه منهم لا دية عليهم ولا كفارة لأن الجهاد فرض والغرامات لا تقرن بالفروض۔[134]

اسی طرح دوسری جگہ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ اس کی وجہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں پر ایسے واقعات میں ضمان اور کفارہ عائد کر دیا جائے، تو کوئی بھی قتال کے لیے آگے نہیں بڑھے گا۔ بھلا ایک شخص قتال تو ثواب کے لیے کرتا ہے، اور کوئی بھی قتال ایسی حالتوں سے محفوظ نہیں ہوتا تو اس میں مبتلا ہو کر وہ ثواب کی بجائے گناہ کما لے، اس خدشے سے تو بندہ مومن قتال ہی چھوڑ بیٹھے گا۔ چنانچہ یہ قتلِ تترس قتلِ خطا نہیں ہے، بلکہ قتلِ مباح ہے۔ لکھتے ہیں:

---

133 المبسوط؛ ج ۱۰، ص ۶۵

134 الھدایۃ؛ ج ۴، ص ۲۲۴

وَلَوْ كَانَ الْمُسْلِمُونَ يَغْرَمُونَ فِي هَذِهِ الدِّيَاتِ، أَوْ يَكُونُ عَلَيْهِمْ فِيهَا الْكَفَّارَاتُ مَا أَقْدَمُوا عَلَى الْقِتَالِ فِي هَذَا، فَكَيْفَ يُقَاتِلُ مَنْ يَجِبُ عَلَيْهِ فِيمَا أَصَابَ الْكَفَّارَةُ، فَإِنْ لَمْ يُؤَدِّهَا كَانَ عَاصِيًا، وَإِنْ مَاتَ قَبْلَ أَنْ يُكَفِّرَ لَقِيَ اللَّهَ تَعَالَى مُذْنِبًا مَأْخُوذًا بِذَنْبِهِ، إلَّا أَنْ يَعْفُوَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، وَفِي هَذَا تَنْصِيصٌ عَلَى أَنَّ الْمُخْطِئَ يَكُونُ آثِمًا، بِخِلَافِ مَا يَقُولُهُ بَعْضُ أَصْحَابِنَا إنَّهُ لَا إثْمَ عَلَى الْمُخْطِئِ اسْتِدْلَالًا بِظَاهِرِ قَوْله تَعَالَى: {وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ}.

فَإِنَّا نَقُولُ فِي التَّنْصِيصِ عَلَى إيجَابِ الْكَفَّارَةِ عَلَى الْمُخْطِئِ بَيَانٌ ظَاهِرٌ عَلَى أَنَّهُ فِي فِعْلِهِ آثِمٌ وَالْمُرَادُ بِالنَّصِّ الْآخَرِ رَفْعُ الْجُنَاحِ عَنْهُ بَعْدَ التَّكْفِيرِ، وَمَا شُرِعَتْ الْكَفَّارَةُ إلَّا سَتَّارَةً لِلذَّنْبِ، وَهَذَا لِأَنَّ التَّحَرُّزَ عَنْ الْخَطَأِ فِي الْجُمْلَةِ مُمْكِنٌ، وَكُلُّ هَذَا التَّقْرِيرِ مِنَّا لِبَيَانِ أَنَّ الْفِعْلَ مَتَى كَانَ مُبَاحًا مُطْلَقًا لَا يَصِيرُ ذَلِكَ سَبَبًا مُوجِبًا لِلدِّيَةِ وَلَا الْكَفَّارَةِ.[135]

احناف کے بر خلاف دیگر ائمہ ثلاثہ رحمۃ اللہ علیہم کے یہاں اس کے بدلے میں مقاتلین پر کفارہ اور ان کی عاقلہ پر دیت عائد ہوتی ہے، کیونکہ ان کے یہاں یہ قتلِ خطا کے حکم میں ہے۔ الا یہ کہ مسلمانوں کو دوسری طرف کفار کے ہمراہ مسلمانوں کی موجودگی کا سرے سے علم ہی نہ ہو۔ ایسے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق نہ دیت عائد ہوگی اور نہ کفارہ، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق دیت تو عائد نہ ہوگی، لیکن کفارہ لازم ہوگا۔ شوافع کے ساتھ حنابلہ نے بھی یہی مسلک اپنایا ہے۔[136]

یہاں یہ واضح رہنا ضروری ہے کہ اگر مجاہدین نے اپنی جانب سے تترس کے مسئلے کی تطبیق کرتے ہوئے کوئی خاص حملہ کیا، لیکن مسئلہ تترس کی تطبیق میں ہی خطا ہوئی جس کے سبب مسلمانوں کا قتل ہو گیا تو ایسے میں احناف کے مطابق بھی یہ صورت قتلِ خطا سے خارج نہ ہوگی، اور اس میں حملہ آور مجاہد پر کفارہ اور اس کی عاقلہ پر دیت عائد ہوگی، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[135] شرح السیر الکبیر؛ج۴، ص۲۲۶

[136] دیکھیے: الجامع لأحکام القرآن للقرطبي؛ ج۱۹، ص۳۳۳، روضۃ الطالبین للنووي؛ ج۱۰، ص۲۴۶، المغني؛ ج۸، ص۳۱۰

فصل ششم: مجاہدین کے ہاتھوں سرزد ہونے والے قتل کی صورتیں اور ان کے احکام

اس فصل میں مجاہدین کی رہنمائی کے لیے مجاہدین کے ہاتھوں سرزد ہونے والے قتلِ مسلم کی صورتیں اور ان کے احکام بیان کیے جارہے ہیں۔ میدانِ قتال سے ادنیٰ واقفیت کی بناپر، اپنی نظر میں جو صورتیں تھیں، ان کا حکم درج کردیا ہے۔

پہلی صورت: دورانِ جنگ جب کفار و مرتدین کی صف میں سے مسلمان کی تمیز ممکن نہ ہو

یہ تترس کی صورت کا بیان ہے کہ جب کفار و مرتدین میں سے مسلمان کی تمیز ممکن نہ ہو اور فقہاء کی بیان کردہ قیود کو ملحوظ رکھتے ہوئے ناگزیر حملہ کیا جائے... جس کی تفصیل سابقہ فصل میں گزر گئی ہے۔ ایسے میں جو مسلمان مارے جائیں، وہ شہید ہیں۔ ان کے بدلے حملہ کرنے والوں پر نہ دیت عائد ہوتی ہے اور نہ کفارہ۔ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے:

ولو أن صفا من المشركين قاتلوا المسلمين ومع المشركين أطفال ونساء أو مستأمنون من المسلمين أو من أسلم منهم في دار الحرب جاز للمسلمين أن يرموا إلى المشركين بضرب وبطعن ويقصدوا بذلك المشركين دون هؤلاء فإن أصاب سهمه هؤلاء وقتل لا تجب الكفارة والدية۔ وكذا لو تترس المشركون بالصبيان والمسلمين لا بأس بالرمي إليهم ويقصدون به الكافرين دون المسلمين۔[137]

ایسی صورت میں اگر ولی مقتول مجاہد کے خلاف دعویٰ کردے کہ اس نے جانتے بوجھتے مقتول کو قتل کیا ہے، تو ایسے میں مجاہد کے لیے قسم اٹھانا کافی ہے کہ اس کا ارادہ کفار کے قتل کا تھا، مسلمان کا نہیں۔ شرح السیر میں امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

---

137 الفتاوی الخانیہ بھامش الفتاوی الھندیۃ؛ ج۳، ص ۵۶۴

فَإِنْ اخْتَلَفَ الرَّامِي وَوَلِيُّ الْمَقْتُولِ بِالرَّمْيَةِ مِنْ الْمُسْلِمِينَ فَقَالَ الْوَلِيُّ: أَقَصَدْته بَعْدَ مَا عَلِمْت أَنَّهُ مُكْرَهٌ مِنْ جِهَتِهِمْ فِي الْوُقُوفِ فِي الصَّفِّ، وَقَالَ الرَّامِي: إنَّمَا تَعَمَّدْت الْمُشْرِكِينَ بِالرَّمْيِ، فَالْقَوْلُ فِيهِ قَوْلُ الرَّامِي مَعَ يَمِينِهِ. لِأَنَّ الرَّمْيَ إلَى صَفِّ الْمُشْرِكِينَ مُبَاحٌ لَهُ، وَذَلِكَ غَيْرُ مُوجِبِ الضَّمَانَ عَلَيْهِ بِاعْتِبَارِ الْأَصْلِ، فَيَجِبُ التَّمَسُّكُ بِذَلِكَ الْأَصْلِ حَتَّى يَقُومَ الدَّلِيلُ بِخِلَافِهِ. ثُمَّ الْوَلِيُّ يَدَّعِي عَلَى الرَّامِي سَبَبَ وُجُوبِ الضَّمَانِ، وَهُوَ تَعَمُّدُهُ إيَّاهُ بِالرَّمْيِ مَعَ الْعِلْمِ بِالْحَالِ، وَهُوَ مُنْكِرٌ. فَكَانَ الْقَوْلُ قَوْلَ الْمُنْكِرِ مَعَ يَمِينِهِ. وَلِأَنَّ الظَّاهِرَ شَاهِدٌ لِلرَّامِي، وَالْمُسْلِمُ لَا يَتَعَمَّدُ الرَّمْيَ إلَى الْمُسْلِمِ. وَمُطْلَقُ فِعْلِ الْمُسْلِمِ مَحْمُولٌ عَلَى مَا يَحِلُّ شَرْعًا. لِأَنَّ دِينَهُ وَعَقْلَهُ يَحْمِلُهُ عَلَى ذَلِكَ وَيَمْنَعُهُ عَنْ ارْتِكَابِ مَا لَا يَحِلُّ، فَلِهَذَا جَعَلْنَا الْقَوْلَ قَوْلَ الرَّامِي فِي ذَلِكَ. إلَّا أَنَّهُ يَحْلِفُهُ لِأَنَّ الْوَلِيَّ يَدَّعِي عَلَيْهِ مَا لَوْ أَقَرَّ بِهِ أَلْزَمَهُ فَإِذَا أَنْكَرَ اسْتَحْلَفَ لِرَجَاءِ نُكُولِهِ.[138]

دوسری صورت: دورانِ جنگ کوئی مجاہد غلطی سے کسی مسلمان کو کافر یا مرتد جانتے ہوئے قتل کردے

اگر دورانِ جنگ کوئی مجاہد کسی مسلمان کو کافر و مرتد سمجھتے ہوئے قتل کردے، تو یہ قتلِ خطا ہے۔ اس میں اس مجاہد پر کفارہ لازم آئے گا اور اس کی عاقلہ پر دیت لازم آئے گی۔ کتبِ احادیث میں مروی دو روایات اس کی دلیل ہیں۔

پہلی روایت سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد سیدنا یمان رضی اللہ عنہ سے متعلق مروی ہے کہ احد کے دن مسلمانوں نے سیدنا یمان رضی اللہ عنہ کو مشرک سمجھتے ہوئے قتل کردیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کی ادائیگی کا فیصلہ فرمایا۔ البتہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے یہ دیت واپس مسلمانوں کے حق میں لوٹادی۔ اصلِ قصہ بخاری و مسلم میں مروی ہے،

---

138 شرح السیر الکبیر؛ ج۴، ص۲۷۶

البتہ دیت کی ادائیگی کی بات دیگر ائمہ نے روایت کی ہے۔[139]

دوسری روایت امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے 'شرح مشکل الآثار' میں اپنی سند سے نقل کی ہے کہ سیدنا سلمہ بن نعیم رضی اللہ عنہ نے یمامہ کے دن ایک مسلمان کو کافر سمجھتے ہوئے قتل کر دیا۔ جب وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مدینہ آئے اور آپ کو واقعہ بیان کر کے استفسار کیا، تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ ان کی عاقلہ پر دیت ہے اور ان پر کفارہ۔ روایت کے الفاظ ہیں کہ سیدنا سلمہ بن نعیم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

شهدت مع خالد بن الوليد يوم اليمامة فلما شددنا على القوم جرحت رجلا منهم فلما وقع قال اللهم على ملتك وملة رسولك وإني بريء مما عليه مسيلمة فعقدت في رجله خيطا ومضيت مع القوم فلما رجعت ناديت من يعرف هذا الرجل فمر بي أناس من أهل اليمن فقالوا هذا رجل من أهل اليمن من المسلمين فرجعت إلى المدينة زمن عمر فحدثته هذا الحديث فقال قد أحسنت اذهب فإن عليك وعلى قومك الدية وعليك تحرير رقبة مؤمنة۔[140]

شرح السیر الکبیر میں لکھا ہے:

فمن ذلك [أي أنواع الخطأ] أن يتعمده بالرمية حين رآه في صف المشركين، وهو يظنه من المشركين، فإذا هو مسلم، وهذا عمد في الحقيقة. لأنه قصد شخصا بعينه وأصابه، فأما ظنه فليس بمتصل بفعله، ولكنه خطأ شرعا عرفناه بالسنة، وهو ما روي {أن سيوف المسلمين اختلفت على اليمان أبي حذيفة رضي الله تعالى عنهما وهم يرون أنه من المشركين فقتلوه، فجعل فيه رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم الدية فترك ذلك لهم حذيفة}.[141]

---

139 اس روایت کے تمام طرق پر امام جمال الدین زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے 'نصب الرایۃ' میں تفصیل سے کلام کیا ہے۔ دیکھیے: نصب الرایۃ؛ ج ۴، ص ۳۴۴تا۳۴۶

140 شرح مشکل الآثار؛ ج ۱۵، ص ۲۴۵

141 شرح السیر الکبیر؛ ج ۴، ص ۲۲۵

تیسری صورت: دورانِ جنگ کوئی مجاہد کفار کی صف میں شامل مجبور مسلمان کو جانتے بوجھتے قتل کردے

دورانِ جنگ کسی مجاہد کو کفار کی صف میں شامل کسی مسلمان کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ کفار اس مسلمان کو مجبوراً اپنے ہمراہ لے آئے ہیں۔ اور یہ مسلمان مسلح نہ ہو اور اس سے کسی قسم کی جنگ کا اندیشہ نہ ہو۔ اس کے باوجود مجاہد عمداً اس کی طرف فائر کرے اور اسے قتل کردے۔ ایسے میں اس مجاہد کے اپنے مال میں دیت لازم آئے گی، جبکہ عمد کی وجہ سے کفارہ لازم نہ آئے گا۔

شرح السیر میں لکھا ہے:

ولو رمى رجل من المسلمين رجلا واقفا في صف المشركين، وهو مسلم قد جاء به المشركون مكرها، والرامي لا يعلم أنه مسلم، أو يعلم إلا أنه لم يتعمده بالرمية، أو تعمده وهو لا يدري أنه مسلم، فهذا كله سواء، وليس على الرامي فيه دية ولا كفارة. لأنه قد حل له الرمي إلى صف المشركين مطلقا، فلا يكون ذلك موجبا عليه تبعة. إلا أن يعلم مسلما بعينه قد جاء به العدو مكرها فتعمده بالرمي، وهو يعلم فحينئذ يلزمه القود في القياس؛ لأنه عمد محض، والعمد موجب للقود، وهذا قياس يؤيده النص، وهو قوله عليه السلام {العمد قود}. وفي الاستحسان لا قود عليه. لأنه في صف المشركين، والرمي إلى صفهم مباح، فكونه في موضع إباحة القتل يصير به شبهة في إسقاط القود؛ لأنه عقوبة تندرئ بالشبهات. ولكن عليه الدية في ماله. لأن الدية تثبت مع الشبهات، وقد أتلف نفسا متقومة. ولا كفارة عليه. لأن فعله عمد.[142]

---

142 شرح السیر الکبیر؛ج ۴، ص ۲۲۴

چوتھی صورت: کفار کی صف میں شامل اسلحہ بردار مسلمان کے قتل کا حکم

پچھلی صورت میں کفار کی صف میں شامل جس مسلمان کے قتل کا ذکر ہوا، وہ وہ مسلمان تھا جس کے بارے میں مجاہدین کو علم تھا کہ وہ غیر مسلح اور مجبور ہے۔ البتہ اگر کوئی مسلمان اپنی مرضی سے کفار کی صف میں شامل ہو، یا مجبور ہو مگر مسلح ہو... اب چاہے یہ مسلمانوں کے خلاف قتال کرے یا نہ کرے۔ اس کا قتل مباح ہے اور جو کوئی مجاہد اسے قتل کر دے تو اس پر کوئی ضمان نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس نے کفار کی صف میں شامل ہو کر اور مسلمانوں کے مقابلے کے لیے اسلحہ اٹھا کر اپنی جان کی حرمت ضائع کر دی ہے۔ شرح السیر میں لکھا ہے:

ولو لقوا في صف المشركين قوما من المسلمين معهم الأسلحة فلا يدرون أمكرهون على ذلك أم غير مكرهين، فإني أحب لهم ألا يعجلوا في قتالهم حتى يسألوهم إن قدروا على ذلك، وإن لم يقدروا فليكفوا عنهم حتى يروهم يقاتلون أحدا منهم، فحينئذ لا بأس بقتالهم وقتلهم. لأن موافقتهم في الدين تمنعهم من محاربة المسلمين وهذا منهم معلوم للمسلمين. فما لم يتبين خلافه، لا يحل لهم أن يقتلوهم، وبمجرد وقوفهم في صف المشركين لا يتبين خلاف ذلك. لأن ذلك محتمل، وقد يكون عن إكراه، وقد يكون عن طوع. فالكف عن قتالهم أحسن حتى يتبين منهم القتال، فحينئذ لا بأس بقتالهم، لأن مباشرة القتال في منعة المشركين مبيح لدمهم وإن كانوا مسلمين. ألا ترى أن أهل البغي يقاتلون دفعا لقتالهم وإن كانوا مسلمين، فبعد ما ظهر هذا السبب لا يمنع قتلهم؛ لأن أكثر ما فيه أنهم مكرهون على ذلك، والمكره على القتل يباح للمقصود بالقتل أن يقتله إذا هم بقتله. ولو كانوا سلوا السيوف، والمسلمون قليل، يخافون إن تركوهم حتى يحملوا عليهم أول مرة أن يقتلوهم، وإن كان أكبر الرأي من المسلمين أنهم غير مكرهين فلا بأس بقتالهم، فحالهم الآن كحال من دخل على غيره ليلا شاهرا سيفه، واشتبه على صاحب الدار حاله.

واستدل عليه بحديث علي رضي الله عنه حين قاتل أهل البصرة، فإنه قال: لا تبدءوهم بالقتال حتى يقاتلوكم، ومقصوده من هذا الاستدلال أن ظهور القتال

من بعضهم كظهوره من جماعتهم في حكم إباحة قتالهم، ولو قتل مسلم رجلا منهم، بعد ما ظهر منهم القتال، ثم قامت البينة من المسلمين أن أهل الحرب أخرجوه مكرها، فلا دية على عاقلته ولا كفارة. لأنه قتل شخصا كان قتله حلالا مع العلم بحاله، وإراقة الدم المباح لا توجب دية ولا كفارة. وكذلك إن كان عليه السلاح، وهو في صف المشركين، ولكنه لم يقاتل أحدا من المسلمين. لأن من كان مستعدا للقتال في صف المشركين فهو مباح الدم وإن كان يستحب التبين في أمره عند التمكن من ذلك.[143]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ملکوں کی افواج اور عسکری اداروں میں جو مسلمان بھی ہوں، تو ان کا قتل مباح ہے... سوائے اس مسلمان کے جو ان اداروں میں مجاہدین کی طرف سے جاسوس ہو۔

اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف بدر کے معرکے میں مشرکین اپنے ساتھ بہت سے مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو بھی لے آئے تھے جنھوں نے اپنا اسلام چھپایا ہوا تھا، ان میں سے بہت سوں کا اسلام خود رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے علم میں تھا۔ اس کے باجود اس جنگ میں مشرکین سمیت ان مسلمانوں کے خلاف بھی قتال ہوا۔ اور ان پر عتاب نازل فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾ [النساء:97]

اس کے شانِ نزول میں امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ سے اور علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں امام طبری و امام ابن منذر رحمۃ اللہ علیہما سے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ روایت بیان فرمائی ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

كان قوم من أهل مكة قد أسلموا وكانوا يخفون الإسلام، فأخرجهم المشركون معهم يوم بدر فأصيب بعضهم، فقال المسلمون هؤلاء كانوا مسلمين فأكرهوا فاستغفروا لهم فنزلت، فكتبوا بها إلى من بقي بمكة منهم وأنهم لا عذر لهم،

143 شرح السیر الکبیر؛ ج۴، ص۲۰۶

فخرجوا فلحقهم المشركون ففتنوهم فرجعوا، فنزلت: [ومن الناس من يقول آمنا بالله فإذا أوذي في الله جعل فتنة الناس كعذاب الله] فكتب إليهم المسلمون بذلك فحزنوا، فنزلت: [ثم إن ربك للذين هاجروا من بعد ما فتنوا] الآية، فكتبوا إليهم بذلك، فخرجوا فلحقوهم، فنجا من نجا وقتل من قتل۔[144]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ملکوں پر مسلط دین دشمن افواج میں کسی مسلمان کے شامل ہونے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ یہ افواج اسلام و شریعت کی دشمن ہیں اور کفار کی آلہ کار ہیں۔ جو کوئی ایسا کرے گا تو اس کے لیے آخرت میں سخت ترین عذاب تیار ہے۔ اس کے پاس یہی حل ہے کہ وہ ان افواج اور ایسے اداروں کو چھوڑ دے، چاہے ایسا کرنے میں اس کا کورٹ مارشل ہو یا اسے انھی کے خلاف لڑنا پڑے[145]۔

پانچویں صورت: مجاہد سے کسی مسلمان کے قتل کے جواز میں اجتہادی خطا ہو جائے

بعض اوقات ایسی صورت بن جاتی ہے کہ مجاہدین کسی شخص کو کسی تاویل کی وجہ سے مباح الدم سمجھ کر قتل کر دیتے ہیں، لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ مجاہدین کی تاویل درست نہ تھی اور وہ مسلمان معصوم الدم تھا۔ یہ صورت بھی قتلِ خطا کی ہے۔ یہ قتل اگرچہ قتل کرنے والے کی طرف سے عمداً ہوا ہے، تاہم چونکہ اجتہاد میں خطا ہوئی ہے، تو اس کا حکم بھی قتلِ خطا کا ہی ہے۔ اس کی دلیل سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے

---

144 دیکھیے: تفسیر ابن کثیر؛ ج ۲، ص ۳۸۸، ۳۸۹، فتح الباري؛ ج ۸، ص ۱۱۶ [کتاب التفسیر: إن الذین توفاهم الملائکة...]

145 یہاں شاید کوئی ہمارے ساتھ اس مسئلے میں اتفاق نہ کرے کہ یہ افواج کفار کی آلہ کار ہیں، بلکہ وہ اپنے ملک کے مسلمانوں کے خلاف ان کی جنگ کا سبب ملکی سالمیت اور حب الوطنی کو سمجھتا ہو۔ ایسے میں وہ اس روایت سے استدلال کرنے کو ہی شاید عبث سمجھے۔ لیکن ہم یہ کہیں گے کہ کیا ملک کے دفاع کے نام پر بھی ان لوگوں کا مجاہدین کے خلاف لڑنا جائز ہو سکتا ہے جو صرف نفاذِ شریعت کی بات کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کا تقوی اور عمل تو یہ تھا کہ بخاری شریف کی روایت میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام سیدنا عکرمہ رحمہ اللہ نے جب ابو الأسود أسدي رحمہ اللہ کو دیکھا کہ وہ سیدنا عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں اہلِ شام کے خلاف لشکر میں شامل ہو رہے ہیں تو انھیں یہ آیت اور غزوہ بدر کا یہ واقعہ سنا کر اس سے باز رہنے کی نصیحت کی۔ کیا یہ استدلال ہمارے لیے حجت نہیں ہونا چاہیے؟ یہ بات الزامی طور پر ذکر کر دی، وگرنہ اس دور میں ان ملکوں کی افواج کا دین دشمن ہونا اب جمہورِ مسلمین پر واضح ہے۔

کہ جب رسول اللہ ﷺ نے آپ کو جَذِیمہ قبیلے کی طرف بھیجا تو وہ لوگ اپنی زبان میں صبأنا صبأنا کہہ کر اپنے اسلام کا اظہار کرنے لگے، لیکن چونکہ یہ لفظ ان کے اسلام پر واضح دلالت نہیں کرتا تو سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انھیں قتل کر دیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَللَّهُمَّ إِنِّي أَبْرَأُ إِلَيْك مِمَّا صَنَعَ خَالِد۔[146]

تاہم یہ چونکہ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف سے بر بنائے اجتہاد تھا تو رسول اللہ ﷺ نے انکار فرمایا، لیکن قصاص لازم نہ کیا۔ بلکہ اس کے سبب دیت ادا کی[147]۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَقَدْ عَذَرَ النَّبِيّ صَلَّى اللَّه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَالِد بْن الْوَلِيد فِي اِجْتِهَاده، وَلِذَلِكَ لَمْ يَقُدْ مِنْهُ. وَقَالَ اِبْن بَطَّال: لَا خِلَاف أَنَّ الْحَاكِم إِذَا قَضَى بِجَوْر أَوْبِخِلَافِ قَوْل أَهْل الْعِلْم أَنَّهُ مَرْدُود، لَكِنْ يُنْظَر فَإِنْ كَانَ عَلَى وَجْه الِاجْتِهَاد فَإِنَّ الْإِثْم سَاقِط، وَأَمَّا الضَّمَان فَيَلْزَم عِنْد الْأَكْثَر. وَقَالَ الثَّوْرِيُّ وَأَهْل الرَّأْي وَأَحْمَد وَإِسْحَاق: مَا كَانَ فِي قَتْل أَوْ جِرَاح فَفِي بَيْت الْمَال. وَقَالَ الْأَوْزَاعِيُّ وَالشَّافِعِيّ وَصَاحِبَا أَبِي حَنِيفَة: عَلَى الْعَاقِلَة.[148]

امام ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ نے جو حاکم کی خطا کا مسئلہ بیان کیا ہے، تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اسی حاکم کی خطا کی ضمان بیت المال سے ادا ہو گی جو ولایتِ عامہ رکھتا ہو، وگرنہ کوئی بھی مجاہد یا کسی سریہ کا امیر غلطی کرے، تو اس کی دیت وغیرہ عاقلہ پر ہی عائد ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعے میں دیت کا ذکر سیدنا خالد

---

[146] صحیح البخاري؛ ص ۱۰۶۱ [کتاب المغازي؛ باب بعث النبي ﷺ خالد بن الوليد إلى بني جذيمة]، سنن النسائي؛ ص ۸۱۳ [کتاب آداب القضاة؛ باب الرد على الحاكم إذا قضى بغير الحق] یہ روایت سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

[147] شرحِ بخاری میں اس روایت کے ذیل میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ سے سہو ہوا ہے کہ انھوں نے اس واقعے اور خثعم علاقے میں سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے قتل کے واقعے کو [جسے ہم نے پچھلی فصل میں بیان کیا ہے] ایک ہی سمجھا ہے اور اس واقعے میں بھی نصف دیت کی ادائیگی کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہ واقعہ خثعم کے واقعے سے الگ ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ان لوگوں کو مکمل دیت ادا کی تھی۔

[148] فتح الباري؛ ج ٦، ص ٣١٦ [کتاب الجزية والموادعة، باب إذا قالوا صبأنا ولم يحسنوا أسلمنا]

بن ولید رضی اللہ عنہ کی عاقلہ پر کیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیت ادا کرنا یہاں تبرعاً تھا۔ شرح السیر الکبیر میں لکھا ہے:

وَعَنْ أَبِي جَعْفَرٍ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ: {لَمَّا بَلَغَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا صَنَعَ خَالِدٌ بِبَنِي جَذِيمَةَ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتَّى رُئِيَ بَيَاضُ إبْطَيْهِ وَهُوَ يَقُولُ: اللَّهُمَّ إنِّي أَبْرَأُ إلَيْك مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ. ثَلَاثَ مَرَّاتٍ. ثُمَّ دَعَا عَلِيًّا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَقَالَ: خُذْ هَذَا الْمَالَ فَاذْهَبْ بِهِ إلَى بَنِي جَذِيمَةَ وَاجْعَلْ أَمْرَ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيْك}.... قَالَ: فَدَلَّهُمْ مَا أَصَابَ خَالِدٌ. فَخَرَجَ إلَيْهِمْ عَلِيٌّ بِذَلِكَ الْمَالِ فَوَدَى لَهُمْ كُلَّ مَا أَصَابَ خَالِدٌ مِنْهُمْ، حَتَّى إنَّهُ أَدَّى لَهُمْ مِيلَغَةَ الْكَلْبِ. حَتَّى إذَا لَمْ يَبْقَ شَيْءٌ يَطْلُبُونَهُ وَبَقِيَتْ مَعَ عَلِيٍّ بَقِيَّةٌ مِنْ الْمَالِ، قَالَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: هَذِهِ الْبَقِيَّةُ مِنْ الْمَالِ لَكُمْ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا أَصَابَ خَالِدٌ مِمَّا لَا يَعْلَمُهُ وَلَا تَعْلَمُونَهُ. فَأَعْطَاهُمْ ذَلِكَ. ثُمَّ انْصَرَفَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ إلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرَهُ الْخَبَرَ. وَفِيهِ دَلِيلٌ أَنَّ الْمُسْلِمِينَ إذَا أَصَابُوا شَيْئًا مِمَّا كَانَ فِي أَمَانٍ أَوْ مُوَادَعَةٍ فَإِنَّهُ يُؤَدِّي لَهُمْ كُلَّ شَيْءٍ أُصِيبَ لَهُمْ مِنْ دَمٍ أَوْ مَالٍ. وَكَانَ خَالِدٌ أَصَابَ ذَلِكَ خَطَأً. وَكَانَتْ عَاقِلَتُهُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأَنَّ قُوَّتَهُ وَنُصْرَتَهُ كَانَتْ بِهِ. وَلِهَذَا أَدَّى ذَلِكَ بِنَفْسِهِ أَوْ تَبَرَّعَ بِأَدَاءِ ذَلِكَ مِنْ عِنْدِهِ. وَهَذَا هُوَ الْأَظْهَرُ فَإِنَّ تَحَمُّلَ الْعَقْلِ فِي الدِّمَاءِ لَا فِي الْأَمْوَالِ، وَمَا أُطْلِقَ مِنْ لَفْظِ الدِّيَةِ فِي بَذْلِ الْمَالِ إنَّمَا أَطْلَقَهُ عَلَى وَجْهِ الْمَجَازِ وَالِاتِّبَاعُ لِبَذْلِ النَّفْسِ. فَاسْمُ الدِّيَةِ حَقِيقَةٌ إنَّمَا يَتَنَاوَلُ بَذْلَ النَّفْسِ، وَلَكِنْ بِاعْتِبَارِ مَعْنَى الْأَدَاءِ يَجُوزُ إطْلَاقُهُ عَلَى بَذْلِ الْمَالِ مَجَازًا. وَفِيهِ دَلِيلُ جَوَازِ الصُّلْحِ عَنْ الْحُقُوقِ الْمَجْهُولَةِ عَلَى مَالٍ مَعْلُومٍ. فَإِنَّهُ قَالَ: هَذَا لَكُمْ مِمَّا لَا يَعْلَمُهُ وَلَا تَعْلَمُونَهُ. وَاسْتَحْسَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَلِكَ مِنْهُ.

سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کی اس خطا کی دو تعبیریں شارحین نے کی ہیں:

اول: صبا کا لفظ اہلِ عرب میں ایک دین چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے ان سے اسے اس لیے قبول نہیں کیا، کیونکہ اس میں اسلام میں داخل ہونے کی صراحت نہیں تھی۔

دوم: امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے عمل کی ایک توجیہ یہ ہے کہ انھوں نے جب انھیں دیکھا کہ یہ واضح لفظوں میں اسلام قبول نہیں کر رہے، بلکہ مبہم لفظ استعمال کر رہے ہیں تو انھوں نے یہی سوچا کہ یہ بد دلی اور غصے میں یہ لفظ ادا کر رہے ہیں، اسلام میں داخل ہونے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ اس تاویل پر آپ نے اقدامِ قتل کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل پر انکار ضرور فرمایا، لیکن وہ انکار اس بنا پر تھا کہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے جلدی کی اور ان لوگوں کی مراد سمجھنے میں احتیاط سے کام نہ لیا۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ شرح مشکل الآثار میں لکھتے ہیں:

فكان من رسول الله صلى الله عليه وسلم ما كان من إنكاره على خالد بن الوليد ما كان منه، أنه قد كان عليه الاستثبات في أمورهم، والوقوف على إرادتهم بقولهم: صبأنا، هل ذلك إلى الإسلام أو إلى غيره؟[149]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ سے اس انکار کی یہ توجیہ بھی بیان فرمائی ہے کہ انکار سے مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کا یہ فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے نہ تھا اور آئندہ لوگ اس قسم کے فعل سے باز آجائیں۔

وَقَالَ الْخَطَّابِيُّ: الْحِكْمَة فِي تَبَرُّئِهِ صَلَّى اللّه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ فِعْل خَالِد مَعَ كَوْنه لَمْ يُعَاقِبهُ عَلَى ذَلِكَ لِكَوْنِهِ مُجْتَهِدًا أَنْ يَعْرِف أَنَّهُ لَمْ يَأْذَن لَهُ فِي ذَلِكَ خَشْيَة أَنْ يَعْتَقِد أَحَد أَنَّهُ كَانَ بِإِذْنِهِ، وَلِيَنْزَجِر غَيْر خَالِد بَعْدَ ذَلِكَ عَنْ مِثْل فِعْله اه مُلَخَّصًا۔[150]

یہاں یہ واضح رہے کہ مجاہدین سے جہاں قتلِ تترس کے فتویٰ کے تحت توسع ہوا ہے اور ناحق مسلمانوں کی جانیں گئی ہیں یا سکول، یونی ورسٹی یا پارک وغیرہ میں کہیں حملہ ہوا ہے جس میں مسلمانوں کی جانیں گئی ہیں... تو یہ سب صورتیں اسی اجتہادی غلطی کی ہیں، اور ان تمام میں ورثائے مقتولین کے لیے حملہ کرنے والوں کی عاقلہ پر دیت اور حملہ کرنے والے پر کفارہ واجب ہوا ہے۔

---

[149] شرح مشکل الآثار؛ ج۸، ص ۲۷۰

[150] فتح الباري؛ ج۱۳، ص ۱۹۴ [کتاب الأحکام، باب إذا قضى الحاکم بجور أو خلاف أهل العلم فهو رد]

یہاں یہ نکتہ بھی واضح ہونا ضروری ہے کہ بعض واقعات ایسے بھی پیش آئے جب استشہادی بھائی نے حملے کی جگہ سے پہلے پولیس کے روکنے پر خود کو اڑا لیا، جس میں ایک دو پولیس والوں کے علاوہ عام مسلمانوں کا قتلِ عام ہو گیا، تو یہ صورت بھی خطا کی ہے۔ استشہادی بھائیوں کو سمجھنا چاہیے کہ وہ صرف اس ضرر سے بچنے کے لیے کہ گرفتاری ہو گی اور راز فاش ہو جائیں گے، دوسرے مسلمانوں کی جان نہیں لے سکتے۔

چھٹی صورت: جنگ میں مجاہدین کے دو گروہ ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے ہوئے باہم لڑ پڑیں

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دشمن کے علاقے میں اندھیرے کے سبب مجاہدین ہی کے دو گروہ ایک دوسرے کو دشمن جان کر باہم لڑ پڑتے ہیں۔ ایسے میں مقتولین کے عوض کسی پر بھی کوئی مواخذہ نہیں۔ نہ ہی دیت اور نہ ہی کفارہ عائد ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اقتتال میں دونوں گروہ اپنے دفاع میں لڑتے ہیں اور دفاع مباح ہے۔ مباح عمل پر کوئی ضمان نہیں ہوتا۔ اس جنگ میں قتل ہونے والے شہید ہوں گے۔ شرح السیر الکبیر میں لکھا ہے:

وَإِذَا الْتَقَتْ السَّرِيَّتَانِ لَيْلًا مِنْ الْمُسْلِمِينَ وَكُلُّ وَاحِدَةٍ تَرَى أَنَّ صَاحِبَتَهَا مِنْ الْمُشْرِكِينَ فَاقْتَتَلُوا فَأَجْلَوْا عَنْ قَتْلَى ثُمَّ عَلِمُوا فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِمْ مِنْ دِيَةٍ وَلَا كَفَّارَةٍ. لِأَنَّ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِنْ السَّرِيَّتَيْنِ بَاشَرَتْ دَفْعًا مُبَاحًا، فَقَدْ قَصَدَتْ كُلُّ سَرِيَّةٍ إِلَى الْأُخْرَى، وَإِنَّمَا قَتَلَتْهَا الْأُخْرَى دَفْعًا عَنْ أَنْفُسِهِمْ. وَذَلِكَ دَفْعٌ مَأْمُورٌ بِهِ شَرْعًا فَلَا يَكُونُ مُوجِبًا دِيَةً وَلَا كَفَّارَةً.

وَالْأَصْلُ فِيهِ مَا رُوِيَ {عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: خَرَجَتْ طَلِيعَتَانِ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ الْخَنْدَقِ لَيْلًا فَالْتَقَتَا تَحْتَ اللَّيْلِ وَلَا يَشْعُرُ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ، وَيَظُنُّونَ أَنَّهُمْ الْعَدُوُّ. فَكَانَتْ بَيْنَهُمْ جِرَاحَاتٌ وَقَتْلَى. ثُمَّ تَنَادَوْا بِشِعَارِ الْإِسْلَامِ فَكَفَّ بَعْضُهُمْ عَنْ بَعْضٍ. وَذَكَرُوا ذَلِكَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

فَقَالَ: جِرَاحَاتُكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ. وَمَنْ قُتِلَ مِنْكُمْ فَهُوَ شَهِيدٌ}.[151]

ساتویں صورت: مجاہدین میں سے کسی نے گولہ چلایا، لیکن وہ انھیں پر پھٹ گیا، جس میں کوئی مجاہد شہید ہو گیا

بعض اوقات ایسا معاملہ بھی پیش آتا ہے کہ مجاہدین مدفعیہ استعمال کر رہے ہوتے ہیں کہ میزائیل یا گولہ پھٹ جاتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ میزائیل یا گولہ وغیرہ چونکہ اس دور میں بیشتر کفار کے بنائے ہوئے موجود ہیں اور بعض میزائیلوں یا گولوں میں کفار ہی ٹریپ لگاتے ہیں، تاکہ مجاہدین استعمال کریں تو یہ پھٹ جائیں اور مجاہدین کو نقصان ہو۔ اگر اس نوعیت کا میزائیل یا گولہ پھٹ جائے تو اس صورت میں کسی قسم کی دیت ہے اور نہ کفارہ۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مجاہدین میزائیل نصب کرنے اور گولہ مارنے وغیرہ میں غلطی کریں، جس سے مجاہدین میں سے کوئی شہید ہو جائے۔ اس صورت کا حکم ہمیں فقہاء کے منجنیق سے پتھر برسانے میں غلطی کے سبب قتل کے حکم سے ملتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایسے صورت میں نصب کرنے والوں پر کفارہ اور اس کی عاقلہ پر اولیائے مقتول کے لیے دیت واجب ہوتی ہے۔ اس میں بعض اوقات ایسی صورت پیش آتی ہے کہ تین مجاہد میزائیل نصب کر رہے تھے۔ میزائیل انھی پر لگا جس سے ان میں سے ایک شہید ہو گیا تو اب دیت ان تینوں کے حساب سے عائد ہو گی، کیونکہ اس فعل کا صدور تینوں کی طرف سے ہوا ہے۔ البتہ جو شہید ہو گیا، اس کا حصہ دیت سے ساقط ہو جائے گا، باقی دو پر اس کے ورثاء کے لیے دو تہائی دیت واجب ہو گی۔ یہ دیت قتلِ خطا ہونے کے سبب عاقلہ پر واجب ہو گی۔ باقی ہر ایک پر کفارہ پورا واجب ہو گا۔

مائن لگاتے ہوئے شہید ہونے کے معاملے میں بھی یہی حکم ہے۔

---

[151] شرح السیر الکبیر؛ ج۱، ص ۴۷۔ اس عبارت میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے جس واقعے سے استدلال کیا ہے، وہ بندے کو کتبِ حدیث اور سیرت میں نہیں ملا۔

منجنیق کے معاملے میں فقہاء نے صرف ان سے قتل کا صدور تسلیم کیا ہے جو رسی کھینچنے والے ہوتے تھے، وگرنہ منجنیق پکڑنے والے اور گولہ ڈالنے والے بھی اس پوری کارروائی میں شریک ہوتے تھے۔ موجودہ دور میں میزائیل اور مارٹر نصب کرنے والے اس حکم میں آئیں گے، کیونکہ میزائیل یا گولہ چلنے کا مدار نصب پر ہے، نہ کہ وہ مجاہد جو میزائیل کو چارج دے یا گولہ مارٹر کی نالی میں ڈالے۔

مائن میں غلطی چارج والی تار جوڑنے سے ہوتی ہے، سو اس میں غلطی کا صدور اسی سے تسلیم کیا جائے گا جو تار جوڑے۔

البتہ اگر میزائیل نصب کرنے والا یا مائن لگانے والا ایک ہی تھا اور وہ شہید ہو گیا، یا دو تھے اور دونوں شہید ہو گئے، تو ایسے میں دیت و کفارہ نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ صورت اپنے ہی حملے سے خود شہید ہو جانے والے کی ہے۔ جس کا حکم آگے بیان ہو گا۔

فتاوی تاتارخانیہ میں لکھا ہے:

ولو رجع حجر المنجنيق فقتلهم الحجر ففيه الدية والكفارة، وتكون الدية على الذين يمدون الحبل، لا على الذين أمسكوا المنجنيق ولا على الذين أمسكوا الحجر وشدوه لهم، وهذا قياس من قبض القوس بيده ثم إن رجلا آخر وضع السهم على الوتر فمد صاحب القوس فأصاب إنسانا، فإن دية المقتول على الذي قبض القوس ومده، لا على الذي وضع السهم على الوتر۔ فإن وقع الحجر على البعض الذين رموا به فقتل رجل منهم، فعليهم ديته يرفع عنهم حصته من الدية، حتى أن الرماة لو كانوا عشرين نفرا، يرفع عنهم جزء من عشرين جزءا من دية المقتول، وكان على كل واحدة منهم كفارة كاملة۔[152]

آٹھویں صورت: دورانِ جنگ کسی مجاہد کا نشانہ چوک جائے اور وہ خود اسی سے شہید

[152] الفتاوی التاتارخانیۃ؛ ج ۷، ص ۱۵۴

ہو جائے

اگر دورانِ جنگ کوئی مجاہد اپنے فائر سے قتل ہو جائے تو اس میں کوئی دیت و کفارہ نہیں ہے اور یہ مجاہد آخرت کے احکام کے اعتبار سے شہید ہو گا۔ جبکہ دنیا میں اسے کفن دیا جائے گا اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی جائے گی۔ اس کی دلیل سیرت سے ہمیں ملتی ہے کہ غزوۂ خیبر میں سیدنا عامر بن اکوع رضی اللہ عنہ نے اپنے مدِ مقابل یہودی پر تلوار سے وار کیا، لیکن وہ چوک گیا اور تلوار خود سیدنا عامر رضی اللہ عنہ کے گھٹنے پر جا لگی۔ جس سے آپ شہید ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کے لیے دو اجر ہیں۔ اس حدیث کو محدثین نے سیدنا سلمہ بن اکوع سے روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں اس پر باب باندھا ہے: [بَاب إِذَا قَتَلَ نَفْسَهُ خَطَأً فَلَا دِيَةَ لَهُ]

شرح السیر میں لکھا ہے:

وذكر عن مكحول: {أن رجلا من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم تناول رجلا من العدو ليضربه فأخطأ فأصاب رجله فنزف حتى مات. فصلى عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال أصحابه رضي الله عنهم: أشهيد هو؟ قال: نعم، وأنا عليه شهيد}.

وتأويل الحديث أنه شهيد فيما تناول من الثواب في الآخرة. فأما من ابتلي بهذا في الدنيا يغسل ويكفن ويصلى عليه، لأن الشهيد الذي لا يغسل من يصير مقتولا بفعل مضاف إلى العدو. وهذا صار مقتولا بفعل نفسه ولكنه معذور في ذلك، لأنه قصد العدو لا نفسه، فيكون شهيدا في حكم الآخرة، ويصنع به ما يصنع بالميت في الدنيا. وهو نظير قوله صلى الله عليه وسلم: {المبطون شهيد، والنفساء شهيد، والمرأة التي تموت بجمع لم تطمث شهيد}....

وذكر عن {سلمة بن الأكوع رضي الله عنه قال: قلت يا رسول الله زعم أسيد بن حضير أن عامر بن سنان بن الأكوع حبط عمله، وكان ضرب يهوديا فقطع رجله ورجع السيف على عامر فعقره فمات منها. فقال: كذب من قال ذلك. إن له لأجرين. إنه جاهد مجاهد وإنه ليعوم في الجنة عوم الدعموص}.

وبه نقول إنه معذور فيما أصيب به، مثاب على ما صنع. فإنه جاهد في قتل الكافر مبالغ في ذلك، مصاب حين رجع إليه السيف فعقره، وصبر على ذلك إلى أن مات، فهو جاهد صابر، و :{إنما يوفى الصابرون أجرهم بغير حساب}. فهذا معنى قوله صلى الله عليه وسلم: {إن له لأجرين}.[153]

نویں صورت: دورانِ جنگ مجاہد کا نشانہ چوک جائے اور اس سے دوسرا مجاہد شہید ہو جائے

اگر دورانِ جنگ کسی مجاہد کا نشانہ چوک جائے اور اس سے دوسرا مجاہد شہید ہو جائے تو اس کا حکم دوسری صورت والا ہی ہے، یعنی یہ قتلِ خطا ہے۔ اس میں قتل کرنے والے مجاہد پر کفارہ لازم ہو گا اور اس کی عاقلہ پر دیت لازم آئے گی۔ شرح السیر میں لکھا ہے:

وإن انقطع وتر الرامي فرجع السهم على رجل مسلم في صف المسلمين، أو مالت الرمية فأصابت رجلا من المسلمين، وقد تقدم للقتال، فعليه الدية على عاقلته والكفارة. لأنه قتله خطأ، وفي الخطأ الدية والكفارة بالنص.[154]

دسویں صورت: دورانِ جنگ کوئی مجاہد عام مسلمان کو جس کا جنگ سے کوئی تعلق نہ ہو، غلطی سے قتل کر دے

دورانِ جنگ اگر کوئی مجاہد کسی مسلمان کو قتل کر دے جو ویسے ہی جنگ کی جگہ موجود ہو اور جس کا جنگ سے کوئی تعلق نہ ہو، تو اس کا حکم بھی قتلِ خطا ہے۔ ایسے میں مجاہد پر کفارہ لازم آئے گا اور اس کی عاقلہ پر دیت واجب ہو گی۔ الا یہ کہ مقتول مسلمِ حربی ہو، تو ایسے میں مجاہد پر صرف کفارہ عائد ہو گا۔

گیارھویں صورت: دورانِ جنگ کوئی مجاہد راہ چلتے مسلمان کو جس کا جنگ سے کوئی تعلق نہ

---

153 شرح السیر الکبیر؛ ج۱، ص

154 شرح السیر الکبیر؛ ج۴، ص ۲۲۵

ہو، بغیر اضطرار کے جان بوجھ کر قتل کر دے

شریعت میں بیان کردہ قتل کے احکام کی روشنی میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت قتلِ عمد کی صورت ہے۔ چنانچہ

- اگر یہ واقعہ دار الاسلام میں ہو اور وہ مسلمان دار الاسلام کا ہو، تو اس مجاہد پر قصاص لازم آئے گا۔
- اگر یہ جنگ دار الحرب میں ہو اور مقتول مسلمان مسلمِ اصلی ہو تو مجاہد پر اپنے مال میں سے دیت لازم آئے گی۔
- اگر یہ جنگ دار الحرب میں ہو اور مقتول مسلمِ حربی ہو تو مجاہد پر کچھ لازم نہ آئے گا، تاہم اس فعل پر عند اللہ اس کی پکڑ ہو گی۔

مجاہدین کی طرف سے دیت کی ادائیگی کا طریقہ

اس دور میں مجاہدین کی جنگ جماعتوں اور گروہوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ ایسے میں کسی مجاہد کی عاقلہ اس کی جماعت یا وہ گروہ ہو گا جس سے وہ وابستہ ہو۔ مجاہدین کے اثر ورسوخ کے علاقے جہاں وہ آزادی سے اسلام کے مطابق عمل کرتے ہیں... چاہے تمام احکام نافذ نہ بھی ہوں... دار الاسلام کے حکم میں ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ان مذکورہ بالا صورتوں میں جو مقتولین بھی دار الاسلام کے ہوں گے، تو ان قتل کے معاملات میں فیصلہ دار الاسلام میں قاضی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ پھر قاضی کے فیصلے کے مطابق دیت کی ادائیگی عمل میں آئے گی۔

اگر مقتول دار الحرب کے رہنے والے ہوں، تو ظاہر ہے کہ ان کے علاقوں پر مجاہدین کو ولایت حاصل نہیں ہے۔ اس لیے دار الاسلام میں کسی قاضی کے فیصلے کا اطلاق دار الحرب میں بسنے والوں پر نہیں ہو گا۔ ایسے میں مجاہدین کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی دیت کی ادائیگی کا واحد حل ان کے ساتھ صلح ہے۔ یعنی مجاہدین کے ہاتھوں دار الحرب کے جو مسلمان مقتول ہوں تو ان کے ورثاء کے ساتھ صلح کی جائے اور صلح میں دیت یا اس

سے کم مال شرعی احکام کے مطابق... جو اس سے قبل بیان کر دیے گئے ہیں... ادا کر دیا جائے۔ ویسے صلح کے نتیجے میں دیت وغیرہ قاتل کے مال میں واجب ہوتی ہے، لیکن چونکہ یہ صلح صرف قاتل کی طرف سے نہیں ہے، بلکہ عاقلہ کی طرف سے۔ اس لیے ہماری صورت میں یہ دیت یا صلح کا مال مجاہدین کی عاقلہ یعنی ان کی جماعت وغیرہ پر ہی واجب ہو گی، واللہ اعلم بالصواب۔

پس مجاہدین کے امراء کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس انداز میں قتلِ خطا کی صورتوں میں دیت وغیرہ ادا کریں۔ اگر وہ قدرت کے باوجود اس میں کوتاہی کریں گے تو وہ عند اللہ معتوب ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آخرت کے عذاب سے ہر مسلمان کو محفوظ فرمائیں، آمین۔

یہاں ہماری تحریر مکمل ہوئی۔ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے اس تحریر کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ تحریر ذوالحجہ ۱۴۳۸ھ کے نصف پر شروع کی تھی اور آج ۱۲ محرم الحرام ۱۴۳۹ھ کو مکمل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے بندے سے قبول فرمائیں، اس کے حق میں اسے توشہ آخرت بنائیں، اور مجاہدین اور مسلمانوں کے لیے نافع بنائیں، آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین!

مراجع و مصادر

یہاں ان کتب کی فہرست دی جارہی ہے جن کے حوالہ جات اس کتاب میں درج کیے گئے۔ حوالہ جات میں چونکہ بیشتر کتب کا حوالہ مکرر آتا رہا ہے، تو وہاں کتاب کی طباعت کا ذکر کرنا دشوار تھا۔ اس فہرست میں ان کتابوں کی طباعت کا ذکر موجود ہے، تاکہ جو قاری حوالہ تلاش کرنا چاہے تو وہ درست طباعت کا انتخاب کرکے تلاش کرلے۔ اسی مقصد کے تحت یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔

کتبِ تفاسیر

1. تفسير القرآن العظيم [تفسير ابن كثير] للحافظ أبي الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي الدمشقي، تحقيق: سامي بن محمد السلامة، دار طيبة، المملكة العربية السعودية
2. معالم التنزيل [تفسير بغوى] للإمام محيي السنة أبي محمد الحسين بن مسعود البغوي، دار ابن حزم، بيروت لبنان
3. أحكام القرآن للإمام أبي بكر أحمد بن على الرازي الجصّاص، تحقيق: محمد الصادق قمحاوي، دار إحياء التراث العربي، بيروت لبنان
4. أحكام القرآن للإمام أبي بكر محمد بن عبد الله ابن العربي، تحقيق: محمد عبد القادر عطا، دار الكتب العلمية، بيروت لبنان
5. الجامع لأحكام القرآن للإمام أبي عبد الله محمد بن أحمد بن أبي بكر القرطبي، تحقيق: الدكتور عبد الله بن عبد المحسن التركي، مؤسسة الرسالة، بيروت لبنان
6. تفسیرِ عثمانی، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، تشکیل جدید: محمد ولی رازی، دار الاشاعت، کراچی

کتبِ حدیث و شروحاتِ حدیث

7. الصحيح الجامع للإمام أبي عبد الله محمد بن إسماعيل البخاري، دار ابن كثير، دمشق۔ بيروت
8. صحيح مسلم، للإمام الحافظ أبي الحسين مسلم بن الحجاج القشيري، دار طيبة،

الرياض
9. السنن للإمام أبي داود سليمان بن الأشعث السجستاني، بيت الأفكار الدولية، الرياض
10. سنن الترمذي للإمام محمد بن عيسى بن سورة الترمذي، مكتبة المعارف، الرياض
11. سنن النسائي للإمام أبي عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي النسائي، مكتبة المعارف، الرياض
12. سنن ابن ماجه، للإمام أبي عبد الله محمد بن يزيد بن ماجه القزويني، تحقيق: شعيب الأرناؤوط، دار الرسالة العالمية، دمشق-حجاز
13. شرح مشكل الآثار للإمام أبي جعفر أحمد بن محمد بن سلامة الطحاوي، تحقيق: شعيب الأرناؤوط، مؤسسة الرسالة، بيروت
14. السنن الكبرىٰ للإمام أبي بكر أحمد بن الحسين بن علي البيهقي، تحقيق: محمد عبد القادر عطا، دار الكتب العلمية، بيروت لبنان
15. نصب الراية لأحاديث الهداية للإمام جمال الدين أبي محمد عبد الله بن يوسف الزيلعي، تحقيق: محمد عوامه، مؤسسة الريان، دار القبلة للثقافة الإسلامية، جدة، المملكة السعودية
16. فتح الباري بشرح صحيح الإمام البخاري للإمام الحافظ أحمد بن علي ابن حجر العسقلاني، تحقيق: عبد القادر شيبة الحمد، طبعة الأمير سلطان بن عبد العزيز آل سعود
17. جامع العلوم والحكم في شرح خمسين حديثا من جوامع الكلم للإمام زين الدين أبي الفرج ابن رجب الحنبلي، تحقيق: الدكتور ماهر ياسين الفحل، دار ابن كثير، دمشق بيروت
18. فتح الباري شرح صحيح البخاري للحافظ زين الدين أبي الفرض إبن رجب الحنبلي، تحقيق: محمد بن عوض المنقوش وأصحابه، مكتبة الغرباء الأثرية، المدينة المنورة
19. فيض القدير شرح الجامع الصغير للعلامة عبد الرؤف المناوي، دار المعرفة، بيروت لبنان

کتبِ فقہ

کتبِ احناف

20. الأصل للإمام محمد بن الحسن الشيباني، تحقيق: الدكتور محمد بوينو كالن، طبعة خاصة بوزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية دولة قطر، دار ابن حزم، بيروت
21. شرح السير الكبير للإمام شمس الأئمة أبي بكر محمد بن أحمد السرخسي، تحقيق: محمد حسن محمد حسن الشافعي، دار الكتب العلمية، بيروت لبنان
22. المبسوط للإمام شمس الأئمة أبي بكر محمد بن أحمد السرخسي، دار المعرفة، بيروت لبنان
23. بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع لملك العلماء الإمام علاء الدين أبي بكر بن مسعود الكاساني، تحقيق: الشيخ عادل أحمد عبد الموجود والشيخ على محمد معوّض، دار الكتب العلمية، بيروت لبنان
24. الفتاوى الخانية للإمام فخر الدين [قاضى خان] حسن بن منصور الأوزجندي، بهامش الفتاوى الهندية، المطبعة الكبرى الأميرية ببولاق مصر
25. المحيط البرهاني في الفقه النعماني للإمام برهان الدين ابن مازة البخاري، تحقيق: عبد الكريم سامي الجندي، دار الكتب العلمية، بيروت لبنان
26. الهداية شرح بداية المبتدئ للإمام برهان الدين أبي الحسن علي بن أبي بكر المرغيناني، اعتنى به: نعيم أشرف نور أحمد، إدارة القرآن والعلوم الإسلامية، كراتشي
27. تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق للإمام فخر الدين عثمان بن علي الزيلعي، المطبعة الكبرى الأميرية ببولاق، مصر
28. فتاوى العلامة الشيخ زين الدين بن نجيم الحنفي المصري، بهامش الفتاوى الغياثية، المطبعة الأميرية ببولاق، مصر
29. الفتاوى التاتارخانية للإمام فريد الدين عالم بن العلاء الإندربتي الدهلوي، تحقيق: شبير أحمد القاسمي، مكتبة زكريا بديوبند، الهند
30. الفتاوى الهندية في مذهب الإمام الأعظم أبي حنيفة النعمان للعلامة الهمام الشيخ نظام

وجماعة من علماء الهند الأعلام، المطبعة الكبرى الأميرية ببولاق مصر
31. حاشية الطحطاوي على الدر المختار للشيخ أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي، المكتبة الأميرية ببولاق، مصر
32. رد المحتار على الدر المختار شرح تنوير الأبصار لخاتمة المحققين محمد أمين الشهير بابن عابدين، تحقيق: الشيخ عادل أحمد عبد الموجود والشيخ على محمد معوّض، دار عالم الكتب، الرياض
33. تقريرات الرافعي على حاشية ابن عابدين [التحرير المختار] للشيخ عبد القادر الرافعي، دار الكتب العلمية، بيروت لبنان
34. معين الحكام فيما يتردد بين الخصمين من الأحكام للإمام علاء الدين أبي الحسن علي بن خليل الطرابلسي، المطبعة الميمنية، مصر
35. تالیفاتِ رشیدیہ مع فتاوی رشیدیہ، حضرت مولانا رشید احمد محدثِ گنگوہی، ادارہ اسلامیات، لاہور
36. فتاوی بینات، ترتیب و تخریج: مجلسِ دعوت و تحقیقِ اسلامی، مکتبہ بینات، کراچی
37. احسن الفتاویٰ، حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی
38. تسہیل بہشتی زیور، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، تسہیل: اساتذہ جامعۃ الرشید، کتاب گھر، کراچی

کتبِ مالکیہ

39. شرح [الإمام أبي عبد الله محمد] الخرشي على مختصر [الإمام أبي الضياء] خليل، المطبعة الكبرى الأميرية ببولاق، مصر
40. تبصرة الحكّام في أصول الأقضية ومناهج الأحكام للإمام برهان الدين أبي الوفاء إبراهيم ابن فرحون اليعمري المالكي، تحقيق: الشيخ جمال مرعشلي، دار عالم الكتب، الرياض

کتبِ شوافع

41. أدب القاضي لقاضي القضاة الإمام أبي الحسن الماوردي، تحقيق: محيي هلال السرحان، مطبعة العاني، بغداد
42. روضة القضاة وطريق النجاة للإمام أبي القاسم على بن محمد بن أحمد الرحبي

السمناني، تحقيق: المحامي الدكتور صلاح الدين الناهي، مؤسسة الرسالة بيروت
43. أدب القضاء للقاضي شهاب الدين أبي إسحاق إبراهيم بن عبد الله الهمداني المعروف بابن أبي الدم الشافعي، تحقيق: الدكتور محيي هلال السرحان، مطبعة الإرشاد، بغداد
44. روضة الطالبين وعمدة المفتين للإمام النووي، اشراف: زهير الشاويش، المكتب الإسلامي، بيروت-دمشق
45. مغني المحتاج إلى معرفة معاني ألفاظ المنهاج للإمام شمس الدين محمد بن الخطيب الشربيني، اعتنى به: محمد خليل عيتاني، دار المعرفة بيروت لبنان

كتب حنابلة

46. المغني على مختصر الخرقي للإمام موفق الدين أبي محمد عبد الله بن أحمد بن محمد بن قدامة المقدسي، تحقيق: عبد السلام محمد على شاهين، دار الكتب العلمية، بيروت لبنان
47. مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام تقي الدين أحمد بن تيمية الحراني، اعتنى به: عامر الجزار، أنور الباز، دار الوفاء، المنصورة، مصر
48. الإنصاف إلى معرفة الراجح من الخلاف للإمام علاء الدين أبي الحسن المرداوي، تحقيق: رائد بن صبري ابن أبي علفة، بيت الأفكار الدولية، أردن
49. كشاف القناع عن متن الإقناع للشيخ منصور بن يونس بن إدريس البهوتي، تحقيق: محمد أمين الضنّاوي، عالم الكتب، بيروت لبنان

كتب في قضايا معاصرة

50. التبرئة [رسالة في تبرئة أمة القلم والسيف من منقصة تهمة الخور والضعف] بقلم الشيخ أيمن الظواهري، السحاب للإنتاج الإعلامي
51. مسئلة التترس في الجهاد المعاصر للشيخ الشهيد أبي يحيٰ [حسن قائد] الليبي، منبر التوحيد والجهاد
52. وبل الغمامة في أحكام الإمامة للشيخ أبي منذر الساعدي، الجبهة الإعلامية الإسلامية العالمية
53. منة الخبير في حكم إقامة الحدود في دار الحرب والتعزير للشيخ الشهيد أبي يحيٰ [حسن

قائد] الليبي، الجبهة الإعلامية الإسلامية العالمية
54. العلاقات الدولية في الإسلام للشيخ الشهيد فارس بن أحمد آل شويل الزهراني، مركز الدراسات والبحوث الإسلامية
55. رسائل ایبٹ آباد[عربی]